شرح اسماء اللہ الحسنیٰ

تصنیف

عارف کامل حضرت مولانا اصغر علی روحیؒ

مواعظ و اسرار

مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس لئے یہ اسم اس ذات پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ یہ اسم تالہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنے تعبد کے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب اپنے بتوں کو الٰہہ بولا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی پرستش کیا کرتے اور انہیں اپنا معبود جانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ذات باری منعم حقیقی ہونے کی وجہ سے مستحق عبادت ہے۔ اس لئے وہ معبود ہے پس الٰہ بمعنی معبود ہوا۔ امام غزالی مقصد اسنیٰ میں لکھتے ہیں کہ اسم اللہ کے متعلق جس قدر اشتقاق کئے گئے ہیں محض تکلفات ہیں۔

(د) اس امر کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ اللہ کو عموماً دعا کے موقع پر اللھم سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ خلیل ابن احمد اور سیبویہ کا مذہب ہے اللھم اصل میں یا اللہ تھا اور میم مشدد اخیر میں حرف ندا کا قائم مقام ہے مگر فراء نحوی کا مذہب ہے کہ اللھم اصل میں یا اللہ امنا بخیر ہے۔ حرف ندا اور صیغہ ام کا (صیغہ امر مشتق از ام یوم بمعنی قصد کرو) ہمزہ ساقط کرنے کے بعد اللھم ہو گیا۔ جیسے ھلم اصل میں ھل ام لھا تھا حذف ہمزہ پر ھلم ہو گیا۔ امام رازی اسی کو اقرب الی الصواب لکھتے ہیں۔ اس مسئلہ میں ہر دو مذہب کے متعلق موافق و موافق دلائل ہیں ہم نے عمداً ان سے اعراض کرنا مناسب سمجھا ہے۔ ہماری کتاب کا موضوع تحقیق لغوی نہیں الا اس حد تک کہ مقتضائے مباحث سے خارج نہ ہو۔

(ہ) مسائل متعلقہ جملہ لا الہ الا اللہ کی تحقیق

مسئلہ

اکثر اہل نحو کا مذہب ہے کہ اس جملہ میں حذف و اضمار ہے۔ چنانچہ اس کی توجیہ دو طرح پر کیا کرتے ہیں۔

(ا) اصل میں لا الہ لنا الا اللہ تھا۔

(ب) اصل میں لا الہ فی الوجود الا اللہ تھا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہر دو توجیہ محل تفکر ہیں۔ کیونکہ پہلی توجیہ کی رو سے اگر گروہ عباد کے الٰہ ثانی کی نفی ہوتی۔ تو یہ کہاں ثابت ہوا کہ دیگر مخلوقات کے لئے بھی ایک الٰہ ہے اس صورت میں توحید خالص معدوم ہو جائے گی۔ دیکھو قرآن مجید میں جملہ الٰھکم الٰہ واحد کے بعد لا الٰہ الا ھو کا ذکر اسی لئے ہوا ہے کہ پہلے جملہ سے صرف گروہ عباد کے الٰہ ثانی کی نفی ہوتی تھی۔ نہ دیگر مخلوقات کے الٰہ ثانی کی اس ظن کے دور کرنے کی خاطر بعد میں جملہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر فرمایا۔ جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ تمام موجودات کا الٰہ ایک ہی ہے۔ اور دوسری توجیہ کے مطابق لازم آئے گا کہ الٰہ ثانی کے وجود کی نفی ہو۔ نہ ماہیت و حقیقت الٰہ ثانی کی جو اس جملہ کا ظاہر مفہوم ہے اور یہ مسلم ہے کہ اخلاص توحید کے مقام میں نفی ماہیت اولےٰ اور اقویٰ ہے۔ بہ نسبت نفی وجود کے پس جملہ لا الٰہ الا اللہ کو ظاہر پر ہی چھوڑنا صحیح ہے۔ حذف و اضمار کی کچھ ضرورت نہیں۔

مسئلہ

[illegible] میں نحاۃ نے لفظ الا کو غیر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور لا الٰہ الا اللہ کو لا الٰہ غیر اللہ کی صورت میں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شاعر کے [illegible] کہا ہے۔

وکل اخ مفارقہ اخوہ لعمر ابیک الا الفرقدان

(ہر ایک دوست اپنے دوست کو چھوڑ جایا کرتا ہے سوائے فرقدان کے۔ ترجمہ)

یہاں الا الفرقدان بمعنی غیر الفرقدین ہے اور یہی خیال صحیح ہے۔ جملہ لو کان فیھما الٰھۃ الا اللہ لفسدتا میں کیونکہ یہاں بھی الا بمعنی غیر کے مستعمل ہوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ہم الا بمعنی غیر نہ سمجھیں بلکہ اس کو استثنیٰ کے معنے میں لیں تو جملہ لا الٰہ الا اللہ کا مطلب یہ ہوگا لا الٰہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

یستثنی عنھم اللہ یعنی ایسے معبودوں کی نفی ہو گی۔ جن سے اللہ مستثنیٰ ہے نہ ایسے معبودوں کی جس سے اللہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔ بلکہ ایسے معبودوں کے وجود کا اثبات لازم آئے گا جن سے اللہ مستثنیٰ نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ صریح کفر ہے۔ پس صحیح طور پر ثابت ہو گیا کہ حرف الا یہاں استثناء کے معنی میں مستعمل نہیں ہے ورنہ اخلاص توحید باطل ہو جائے گا۔

یہاں اس نکتہ کا بیان کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ معلوم ہے کہ کسی چیز کے اثبات کا تصور اس کی نفی کے تصور پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ مگر جملہ لا الہ الا اللہ میں نفی کو اثبات پر مقدم رکھا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تقدیم نفی میں کئی ایک اغراض ملحوظ ہیں۔ اول یہ کہ نفی الوہیت غیر اللہ کرنے کے بعد اثبات الوہیت ذات باری کے لئے کرنا زیادہ موکد سمجھا گیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ اگر ہم یوں کہیں لیس فی البلد عالم غیر زید (شہر میں زید کے سوا کوئی عالم نہیں) تو یہ جملہ زید عالم فی البلد کی نسبت زید کے عالم ہونے کو زیادہ موکدانہ طور پر ثابت کرتا ہے۔ دوم چونکہ ایک وقت میں قلب ایک ہی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اور جب ایک امر کی طرف توجہ کرے گا تو دوسرے امر کی طرف سے محروم رہ جائے گا۔ اس لئے جملہ لا الہ الا اللہ میں جب لا الہ کہا جاتا ہے تو تمام ماسوی اللہ کی نفی ہو کر قلب خالی ہو جاتا ہے اور جب الا اللہ کہا جاتا ہے تو انوار توحید کا محل ہو جاتا ہے اور قلب کو کسی امر غیر کی طرف کچھ لگاؤ نہیں رہتا۔ لہذا نفی کا مقدم کرنا اخلاص توحید کے لئے اہم ہے۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے نماز سے پہلے وضو شرط ہے۔ کیونکہ طہارت کے بعد نماز کا ادا کرنا مقصد نماز کے لئے زیادہ موجب تکمیل ہے۔ اسی طرح لا الہ بھی قلب کو تعلق ماسوی اللہ سے بالکل پاک کر دیتا ہے۔ یا یوں کہو کہ جس طرح قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے استعاذہ (اعوذ پڑھنا) وساوس شیطانیہ سے موجب امن ہوتا ہے اس طرح جملہ لا الہ الا اللہ میں نفی کا اثبات توحید پر مقدم لانا ضروری ہے۔ سوم یہ ضروری ہے کہ جو شخص

کسی جلیل القدر بادشاہ کو کسی مکان میں لانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے اس مکان کو ہر ایک قسم کی نجاسات سے پاک و صاف بنائے۔ تب بادشاہ کو اس مکان میں نازل ہونے کی تکلیف دے سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل تحقیق نے کہا ہے کہ جملہ لا الہ الا اللہ کا نصف اول بمنزلہ تنظیف کے لئے ہے۔ یعنی قلب کو پاکیزہ کرنا اور نصف ثانی بمنزلہ جلاء انوار کے ہے۔ یعنی انوار توحید سے قلب کو مزین کرنا۔ یا یوں کہو کہ نصف اول اشارہ ہے طرف فناء کی اور نصف ثانی اشارہ ہے۔ طرف بقاء کی۔

مسئلہ

جملہ لا الہ الا اللہ کے متعلق یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کو بذریعہ استدلال صحیح اس امر کا یقین ہو جاوے کہ عالم کائنات کے لئے ایک صانع حکیم کا وجود ضروری ہے تو اس علم یقینی کے بعد اس کو اس امر کا علم کیا مفید ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی دوسرا شریک یا اس کا مثل موجود نہیں کیونکہ یہ امر فی حد ذاتہ ذات باری کے لئے موجب کمال نہیں ہو سکتا۔ یعنی کیا وجہ ہے کہ صرف ذات باری کے صانع عالم اور حکیم کامل ہونے پر ایمان لانا حصول سعادت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس ایمان کے ساتھ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ اس کا کوئی مثل یا شریک موجود نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مثل یا شریک کی نفی پر ایمان نہیں ہو گا تو عبد کو یہ کیسے معلوم ہو گا کہ وہ صرف کسی ایک ہی کا عبد ہے۔ یا دو کا۔ اس صورت میں اس کا شکر و طاعت بجا لانا کس کے لئے ہو گا؟ اور اس کو کیسے یقین ہو گا کہ وہ صرف ایک ہی کا محتاج ہے۔ کیونکہ اس کو اس خیال کا موقع ہو گا کہ اگر ایک میرے اعمال کو قبول نہیں کرے گا تو دوسرا سہی لیکن نفی شریک و مثل پر ایمان لانے کی صورت میں اس کو یقین ہو گا کہ عالم کا معبود صرف ایک ہی ہے۔ تب وہ کامل اخلاص کے ساتھ حق عبودیت کو ادا کرے گا۔ اور صرف اسی

toobaa-elibrary.blogspot.com

کا ہو کر رہے گا۔

مسئلہ

اس مقام پر اس مسئلہ سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے۔ کہ گر کوئی شخص بذریعہ استدلال صحیح حقیقت توحید پر ایمان لے آئے مگر اسے اتنا وقت نہیں ملا کہ جملہ لا الہ الا اللہ کو زبان پر لائے۔ اور مر جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ صاحب ایمان ہو کر مرے گا۔ کیونکہ اس نے حق واجب کو ادا کر دیا۔ مگر اقرار زبانی کی مہلت نہ پا سکا۔ لیکن ایمان لے آنے پر اگر اسے مہلت اقرار زبانی کی مل گئی تھی مگر اس نے زبان سے اقرار نہیں کیا اور مر گیا تو ایسے شخص کی نسبت بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ صاحب ایمان نہیں اور بعض کا مذہب ہے کہ وہ صاحب ایمان ہے۔ مگر فاسق ہے۔ دلائل کی تفصیل اپنے موقع پر مذکور ہے۔

مسئلہ

اس امر کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ آیا کلمہ لا الہ الا اللہ زبان پر لاتے وقت حرف نفی یعنی لا کو مد صوت کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔ یا بلا مد صوت بعض علماء کا خیال ہے کہ مد صوت اولیٰ ہے کیونکہ اثناء مد صوت میں تمام غیر اللہ کو حاضر فی الذہن کر کے ان کی نفی کرنا اور بعد میں الا سے اثبات کرنا تکمیل توحید کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ بلا مد صوت کہنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ مد صوت کے اثنا میں اسے موت آجائے اور الا اللہ یعنی اثبات توحید سے محروم رہ جائے۔ ہر دو خیال جائے خود صحیح ہیں۔ مگر حق اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کافر اس کلمہ کو بغرض اظہار ایمان پہلی دفعہ زبان پر لائے تو مد صوت نہیں چاہیے تاکہ بہت جلد اقرار توحید سے عہدہ برا ہو جاوے۔ ہاں اگر کوئی شخص مومن بطور تقویت و تجدید ایمان کے زبان پر لائے تو مد صوت بہتر ہے۔ تاکہ تمام غیر اللہ کو حاضر فی الذہن کر کے ان کی نفی کرے۔

مسئلہ

واضح ہو کہ کلمہ لا الہ الا اللہ کے تلفظ میں لوگوں کے مدارج مختلف ہیں۔

(ا) اول طبقہ کے وہ لوگ ہیں جو صرف زبانی اقرار تک محدود رہتے ہیں۔ جس کا اثر یا حکم یہ ہے کہ ان کے جان و مال سیف اسلام سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الا الہ الا اللہ فاذا قالوھا عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے حکم ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتی کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ سو جب وہ ایسا کر چکیں تو ان کے نفوس و اموال بدوں اس حالت کے کہ حق شریعت میں ان پر مواخذہ عائد ہو سکے۔ ہر ایک حالت میں محفوظ ہو جائیں گے۔ اس طبقہ میں مومن' منافق' کافر' مشرک' صدیق زندیق سب شریک ہیں۔ اور ان میں کوئی امتیاز نہیں۔

(ب) طبقہ دوم کے وہ لوگ ہیں جو اقرار زبان کے ساتھ اعتقاد قلبی بھی رکھتے ہوں مگر بطور تقلید نہ بطور تحقیق چونکہ ایمان باللہ میں تقلید صحیح نہیں بلکہ ہر ایک کو بقدر استطاعت دلائل و براہین سے حقیقت توحید کا سمجھنا ضروری ہے۔ اس لئے علماء کا اختلاف کیا ہے کہ ایسے مقلد کا ایمان صحیح ہے یا نہیں؟ مگر یہ بالاتفاق صحیح ہے۔ کہ ایسا شخص عارف نہیں کہلا سکتا۔

(ج) طبقہ سوم کے وہ لوگ ہیں جو اقرار و اعتقاد کے ساتھ دلائل ظنیہ کا علم بھی رکھتے ہوں۔ مگر دلائل قاطعہ کے درجہ سے قاصر ہوں۔ اس مقام کے لوگ وساوس سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔

(د) طبقہ چہارم کے وہ لوگ ہیں جو حقیقت توحید کا بذریعہ دلائل قطعیہ علم رکھتے ہوں۔ گو وہ مقام مشاہدہ' مکاشفہ' تجلی سے قاصر ہوتے ہیں۔ ان کا علم یقینی ہونے کی وجہ سے انہیں دیگر طبقات سے خاص امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

تعداد بہت قلیل ہوتی ہے۔

(۵) طبقہ پنجم کے وہ لوگ ہیں جن کو اصحاب مشاہدات بولتے ہیں۔ ان کی تعداد اقل قلیل ہے۔ اور ان میں بھی بے شمار مدارج ہوتے ہیں۔

مناسبت مقام کے رو سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب مکاشفات کے مدارج کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

واضح ہو کہ ارباب حقیقت نے تو مکاشفات کے لئے چھ مدارج قائم کئے ہیں۔ تین تو مبتدی لوگوں کے لئے ہیں۔ اور باقی تین منتہی لوگوں کے لئے مبتدی لوگوں کے لئے جو مدارج قائم کئے گئے ہیں۔ انہیں لوائح' لوامع' طوالع' بولتے ہیں۔ توجیہ ان مدارج کی یہ ہے کہ انوار معرفت کا انکشاف اگر اس طرح ہو کہ انکشاف کے ہوتے ہی پھر استتار (اختفاء) کی حالت عود کر آئے۔ جس طرح کہ برق چمک دے کر رہ جاتی ہے تو ایسی حالت کو لوائح کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک عارف اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

وافترقنا حولاً فلما التقینا کان تسلیمه علی وداعاً

یعنی دوست سے سال بھر جدا رہا اور جب ملاقات ہوئی تو اس قدر جلدی مفارقت ہو گئی کہ اس کا سلام زیارت سلام وداع تھا۔ مگر یہی حالت جب بار بار عود کرتی ہے اور قلب سلیم میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو انکشاف مذکورہ بالا کو ایک گونہ استقلال ہو جاتا ہے۔ اور حالت تجلی دیرپا ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اس کو لوامع سے تعبیر کیا کرتے ہیں اور اگر اس مقام سے زیادہ ترقی حاصل ہو اور تجلیات قوی طور پر وارد ہونے لگیں تو انہیں طوالع بولتے ہیں مگر یہ حالت بھی خطر زوال سے محفوظ نہیں ہو سکتی ہاں یہ بات ضرور ہے کہ تجلیات کے قوی ہونے کی وجہ سے ان کا اثر بالکل زائل نہیں ہو جاتا بلکہ ان کے انوار کے برکات قلب پر لگاتار موجود رہتے ہیں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے کہ آیۂ قرآنیہ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا میں۔

منتہی لوگوں کے مدارج انکشاف کو الفاظ محاضرہ۔ مکاشفہ۔ مشاہدہ کے

ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ محاضرہ حضور قلب کی اس حالت کا نام ہے جس میں دلائل و براہین حقہ متواتر قلب پر وارد ہونے لگتے ہیں جن سے قلب میں ایک ایسا نور پیدا ہو جاتا ہے جس کی روشنی سے سالک اپنے سیر میں کامل طور پر مستعد ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مکاشفہ کی حالت ہے جس سے سالک دلائل و براہین سے بالکل مستغنی ہو جاتا ہے۔ محاضرہ کی حالت میں سالک اختیار رکھتا ہے کہ دلیل سے مدلول کی طرف انتقال کرے مگر مکاشفہ میں دلائل سے حضرت حق کی طرف منتقل ہونے میں سالک کا اختیار نہیں ہوتا۔ بلکہ جونہی کسی امر کا مشاہدہ کرتا ہے بلا اختیار حضرت حق کی طرف منجذب ہو جاتا ہے اس کے بعد مشاہدہ کا مقام ہے یہ وہ حالت ہے جس میں انوار تجلیات کا سلسلہ لگاتار بلا انقطاع جاری رہتا ہے اس کی مثال اعینہ ایسی ہے جیسے فرض کر لیا جاوے کہ تجلی شب تاریک میں بلا وقفہ متواتر اپنی چمک دیتی رہے اور ایک آن بھی منقطع نہ ہو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں رات کا سماں بالکل دن کا سا نظر آئے گا یہی حالت ہوتی ہے قلب سلیم کی اس وقت جب کہ انوار تجلیات کا سلسلہ متواتر جاری رہتا ہے یہ مقام غایت ترقی پر مبنی ہے اور اسی کی طرف کسی کامل نے یوں اشارہ کیا ہے۔

لیلی بوجهك مشرق وظلامه فی الناس سائری
والناس فی کصدف الظلام ونحن فی ضوء النهار

یعنی میری سیاہ رات تیرے جمال جہانتاب سے روشن ہو گئی ہے اور اس کا اندھیرا دوسرے لوگوں تک پہنچ گیا ہے اور وہ اندھیرے میں پڑے ہیں اور ہم دن کی روشنی میں ہیں۔

مذکورہ بالا ہر سہ مراتب کی مثال خواب۔ اور بیداری کی سی ہے یعنی جس طرح ان مدارج کے انکشاف میں بلحاظ خفا اور وضاحت کے امتیاز ہوتا ہے اس طرح محاضرہ' مکاشفہ' مشاہدہ میں جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے خفی و جلی ہوا کرتی ہیں۔ چنانچہ مشاہدہ میں حقائق اشیاء بلا کسی قسم کے خفا کے ہو بہو منکشف ہوتی ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

واضح ہو کہ مقام مشاہدہ نہایت عالیشان مقام ہے اس لئے اس مقام میں کوئی لوٹنے سے اوتے فتور بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے ایک حدیث میں حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں انہ لیغان علی قلبی وانی لاستغفر اللہ فی الیوم واللیلۃ سبعین مرۃ یعنی میرے قلب پر ایک قسم کی تیرگی سی آجاتی ہے اور میں اللہ تعالیٰ سے رات دن میں ستر دفعہ استغفار کرتا ہوں (مراد کثرت استغفار سے ہے) اس حدیث کی توجیہ میں چند اقوال ہیں۔ اول یہ کہ مقتضائے بشریت ایک گونہ سستی یا غفلت عارض ہو جاتی ہے۔ تو میں اس کے رفع کرنے میں استغفار سے مدد لیتا ہوں۔ دوم یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ مدارج عالیہ پر ترقی کرتے رہتے تھے پس جب ایک مقام سے دوسرے مقام پر ترقی پاتے۔ اور موجودہ مقام کو سابق کی نسبت مرتبہ پاتے تو سابق کو ادائے حق عبودیت کے رو سے حقیر سمجھتے اور اسی لئے استغفار کی طرف ملتجی ہوتے تاکہ اس مقام میں جو تقصیر ادائے حق عبودیت میں واقع ہوئی ہے۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ سوم یہ کہ جب مقام اعلیٰ پر ترقی ہوتی تو اس مقام کے معارف و اسرار میں اس قدر استغراق ہوتا کہ اس کی محویت میں تبلیغ رسالت کے فرض میں ایک گونہ تقصیر ہو جاتی۔ اس لئے حضور بذریعہ استغفار اس تقصیر سے بریت حاصل کرتے بہر صورت اس حدیث میں حضور علیہ السلام کے استغفار کی حقیقت کا مفہوم حضور علیہ السلام کے ترقی مدارج کی کیفیت کے سمجھنے پر منحصر ہے کیونکہ ہر ایک مقام میں بوجہ تعلق بشریت کچھ نہ کچھ آثار بشریت کا موجود ہونا ضروری ہے جو اس سے اگلے مقام پر ترقی کرنے سے خفیف ہو جاتے ہیں۔ اور اس سے اگلے مقام پر اور بھی خفیف صورت میں رہ جاتے ہیں علی ہذا القیاس انہیں آثار خفیفہ بشریت کے بقیہ پر حضور علیہ السلام کو استغفار کی ضرورت محسوس ہوا کرتی۔ اور یہی اس حدیث کی صحیح توجیہ ہے اور انہیں بقایا آثار بشریت کو حضور علیہ السلام کی نسبت قرآن مجید میں ذنب سے تعبیر کیا گیا۔ حیث قال واستغفر لذنبك گویا ذنب کا لفظ محض بطور اشتراک اسی استعمال کیا گیا ہے

مخالفین اس آیت میں لفظ ذنب سے وہی حقیقت ذنب اخذ کیا کرتے ہیں جو عوام الناس کے لئے مقرر ہے جس میں ہر ایک قسم کے گناہ کا مفہوم داخل ہے معاذ اللہ اور وہ نہیں سمجھتے کہ مقربین بارگاہ کے حق میں خفیف سے خفیف آثار بشریت کا وجود بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے کما قیل۔

وجودك ذنب لا یقاس بہا ذنب

یعنی آثار بشریت کا خفیف سے خفیف تعلق بھی گناہ عظیم ہے یہی معنی ہیں جملہ حسنات الابرار سیئات المقربین کے۔

امام غزالی اپنی کتاب المقصد الاسنیٰ میں لکھتے ہیں کہ اسم اللہ مجملہ ننانوے اسماء ذات باری کے اعظم الاسماء قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ دلالت کرتا ہے۔ اس ذات اقدس پر جو موجود حقیقی ہے اور جو تمام کمالات حقیقیہ کی جامع ہے حتیٰ کہ اس کے مفہوم میں دیگر تمام صفات کمالیہ مثلاً علم قدرت ارادہ سمع بصر وغیرہ کا مفہوم بھی شامل ہے اور کوئی دوسرا اسم اس قدر جامعیت کمالات پر مشتمل نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ نہ تو حقیقۃً کسی غیر پر اطلاق کیا جا سکتا ہے نہ مجازاً حالانکہ دیگر اسماء کا اطلاق مجازاً غیر پر کیا جا سکتا ہے مثلاً بطور مجاز رحیم علیم کریم وغیرہا اسماء کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے چونکہ ہر ایک اسم ذات باری کے مقتضاء سے انسان کامل کو ایک خاص بہرہ حاصل ہوتا ہے اس لئے اس اسم جلالت سے عارف کامل کو یہ بہرہ ملتا ہے کہ اس کا قلب تمام ماسوا سے اعراض کر کے ذات واحد میں مستغرق ہو جاتا ہے اور بجز ذات حقیقی کے کسی چیز سے نہ تو خوف کرتا ہے نہ اس سے امید رکھتا ہے بلکہ تمام اشیاء کے بطلان وجود کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے اور کسی چیز کو وجود حقیقی سے موجود نہیں دیکھتا یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ عرب کے تمام اشعار میں لبید کا قول۔

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل
وکل نعیم لا محالۃ زائل

toobaa-elibrary.blogspot.com

اصدق الاقوال ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بجز ذات واحد کے تمام اشیاء نیست اور سب لذتیں معرض زوال میں ہیں۔

خاصیت

جو شخص ہزار مرتبہ روزانہ پڑھے اللہ تعالیٰ اس کو کمال یقین نصیب فرماویں اور جو شخص جمعہ کے روز قبل نماز جمعہ کے پاک و صاف ہو کر خلوت میں دو سو بار پڑھے اس کا مطلب آسان ہو خواہ کیسا ہی مشکل ہو اور جس مریض کے علاج سے اطباء عاجز آگئے ہوں اس پر پڑھا جاوے تو اچھا ہو جاوے بشرطیکہ موت کا وقت نہ آگیا ہو۔

دعاء

لا اله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شئى قدير الحمد لله وسبحان الله ولا اله الا الله والله اكبر ولاحول ولا قوة الا بالله۔ (حصن حصين)

الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ

جل جلاله

(ا) اہل عربیت اس پر اتفاق رکھتے ہیں کہ لفظ (رحمٰن عربی ہے مگر ثعلب نحوی کا خیال ہے یہ لفظ عبرانی ہے جو اصل میں رحمانا تھا۔ اہل عرب نے خاء معجمہ کو حاء مہملہ سے بدل لیا اور حرف الف کو اخیر سے حذف کر دیا ثعلب کے وجوہ سے امام رازی نے اپنی کتاب لوامع البینات میں لکھے ہیں اور علامت کیا ہے کہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے اور رحمت سے مشتق ہے۔ امام غزالی لکھتے ہیں کہ لفظ رحمٰن یقیناً رحمت سے مشتق ہے اور یہ رائے واقعی صحیح ہے۔ کیونکہ اہل عرب کے ہاں یہ لفظ مروج تھا عمرو بن زید بن نفیل کا شعر ہے۔

ولكن اعبدالرحمن ربى ليغفر لذنبى الرب الغفور

(ب) علماء نے حقیقت رحمت میں بہت کلام کیا ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ رحمت ذات باری کی صفت ہے جس کے معنی ارادہ ایصال ثواب و خیر کے ہیں اس صورت میں رحمت صفت ازلی ہو گی یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں اہل ایمان کے حق میں عطاء نعمت کا ارادہ کیا تھا دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ رحمت کا مفہوم صرف ارادہ خیر تک محدود نہیں بلکہ ایصال خیر اور دفع شر ہر دو کا مفہوم

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس میں شامل ہے۔ یعنی رحمت صفت فعل ہے۔ نہ صفت ذات مگر حق یہ ہے کہ گو بطریق عموم قرآن مجید میں ہر ایک قسم کی خیر و نعمت پر لفظ رحمت کا اطلاق ہوا ہے مگر یہ لفظ حقیقۃً دفع بلاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ صرف ارادہ خیر مستلزم کمال حقیقی نہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے ان للہ مائۃ رحمۃ وانہ انزل منھا واحدۃ الی الارض فقسمھا بین خلقہ فبھا یتعاطفون وبھا یتراحمون وآخر تسعاً و تسعین لنفسہ یرحم بھا عبادہ یوم القیامۃ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے سو رحمتیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک کو اس نے اپنے بندوں میں تقسیم کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بندگان خدا باہم پیار اور محبت کرتے ہیں۔ اور ننانوے رحمتیں اس نے اپنی ذات کے لئے مخصوص کی ہیں۔ جن کو قیامت کے دن اپنے بندوں کے حق میں ظاہر کرے گا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث میں صرف ارادہ خیر کے معنی صحیح نہیں۔ اس لئے رحمت صفات فعل میں سے ہے۔ نہ صفات ذات میں سے۔

(ج) علماء نے اس مسئلہ میں بہت کچھ بیان کیا ہے کہ آیا کفار کے لئے بھی دینی یا دنیوی نعمتیں ہو سکتی ہیں؟ اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ دینی نعمتیں کفار کے لئے قطعاً موجود نہیں۔ دنیوی نعمتوں میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ کفار کے لئے دنیوی نعمتیں بھی مقدر نہیں۔ اور وہ لذات و منافع اور صحت و سلامت جو انہیں حاصل ہیں۔ محض بطور استدراج ہیں۔ جن کا انجام ان کے حق میں مفید نہیں۔ جیسے وہ لذیذ شے جس میں زہر ملا دی گئی ہو۔ گو بظاہر لذت بخش ہے۔ مگر بہر حال کھانے والے کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح دنیا کی تمام نعمتیں جن سے کفار متمتع ہو رہے ہیں۔ ان کے حق میں بالآخر موجب ضرر ثابت ہونے والی ہیں۔ اس لئے حقیقتاً ان پر لفظ نعمت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیۃ کَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ میں محض نظر بظاہر بطور مجاز ان اشیاء کو نعمت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اگر وہ لوگ ایمان لے آتے تو وہ اشیاء ظاہر و باطن میں

ان کے حق میں نعمت ثابت ہوتیں۔ لیکن ان کے کافر ہونے کی وجہ سے یہ اشیاء بظاہر صورت میں ان کے حق میں نعمت تھیں۔ نہ حقیقت میں کیونکہ یہی اشیاء ان کے لئے موجب معصیت و طغیان ہو کر ان کے لئے باعث ہلاکت و عذاب ثابت ہوئیں۔ اس لئے فی الحقیقت نعمت نہیں ہو سکتیں۔ معتزلہ کا مذہب ہے کہ کفار کے لئے دینی اور دنیوی ہر دو قسم کی نعمتیں ہیں۔ دنیوی تو ظاہر ہیں۔ اور دینی کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دلائل و اسباب سعادت ان کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جن سے وہ منتفع ہو سکتے ہیں۔ مگر حق وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ یعنی کیا وہ کفار یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جن اشیاء یعنی مال و فرزند سے ان کی امداد کرتے ہیں تو ان کے لئے خیر و سعادت میں جلدی کرتے ہیں۔ (نہیں) بلکہ وہ اس امر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ دیکھو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیوی نعمتوں کی ان کے لئے نفی کر دی کہ وہ خیرات نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشیاء ان کے حق میں در حقیقت نعمت نہیں۔

(د) [illegible] قابل غور ہے کہ رحمت الٰہی اور رحمت بندگان میں بلحاظ کمال و [illegible] کے کئی ایک وجوہ سے تفاوت ہے۔

اولاً وہ رحمت جو بندگان خدا سے ظاہر ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قلب بندہ میں پیدا کرنے سے موجود ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رحمت الٰہی اکمل ہے۔ بہ نسبت رحمت بندگان کے۔

(ثانیاً) بندگان خدا سے جس رحمت کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ در حقیقت ایک قسم کی رقت قلب کا نتیجہ ہے۔ اور یہ رقت قلب ایک قسم کا الم ہے۔ جس کو دل سوزی کہتے ہیں اور یہ امر کسی خارجی حالت سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اس امر سے بری ہے کہ وہ کسی غیر سے متاثر ہو مثلاً باپ اپنے بیٹے کی حالت خستہ پر رحم کر کے اس کی اصلاح میں سعی کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دل سوزی کے الم کو جو بھوکے کی تنگی کی وجہ پیدا ہوا تھا۔ رفع کرتا ہے۔ یا کوئی شخص بامید ثواب آخرت غرباء پر صدقہ و خیرات تقسیم کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ وہ یہ سوچتا ہے کہ عذاب جہنم سے نجات پائے گا۔ علی ہذا القیاس انسان سے جس قدر رحمت کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا رحمت کرنا کسی غرض پر مبنی نہیں۔ وہ جواد مطلق ہے۔ اور متاثر ہو کر یا کسی غرض کے تابع ہو کر وہ رحمت کا اظہار نہیں کرتا برخلاف انسان کے کہ اس میں یہ ہر دو باتیں موجود ہیں۔ جو ذات باری کے لئے موجب نقص ہیں۔

(ثالثاً) بندہ دوسرے شخص سے جس قدر احسانات کرتا ہے ان کے اسباب وہی امور ہوتے ہیں جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور انعام حاصل ہوتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ در حقیقت انسان جائے خود کسی احسان کا مالک نہیں بلکہ جو احسان کرتا ہے اس کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اس لئے حقیقۃً اللہ تعالیٰ ہی منعم حقیقی ہے اور اس لئے وہ بدرجہ اکمل رحیم ہے۔

(رابعاً) بندہ جب احسان کرتا ہے تو مقدار بذل احسان اس کے خزانہ اور مال میں کمی واقع ہو جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے خزانہ رحمت میں کمی و بیشی کو دخل نہیں کیونکہ اس کے مقدورات لامتناہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے بذل کرتے وقت اس کے دل میں ایک خیال مخالف جو مانع بذل ہوتا ہے۔ پیدا ہو کر احسان سے روکتا ہے یا کمی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ امر ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۵) رحمان اور رحیم ہر دو اسم رحمت سے مشتق ہیں۔ اگر ان ہر دو میں معنی کے رو سے کچھ فرق نہ ہو تو ان ہر دو کو مترادف ماننا پڑے گا۔ مگر ایک جم غفیر علماء محققین کا یہ مذہب ہے کہ رحمٰن میں رحیم کی نسبت صفت رحمت کا مبالغہ ہے۔ کیونکہ ترکیب یا رحمٰن الدنیا اور رحیم الاخرۃ سے اس امر کا

پورا ثبوت ملتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ رحمت دنیا مومن و مشرک اور مطیع و عاصی سب کو شامل ہے۔ جس سے ایک قسم کا عموم پایا جاتا ہے۔ اور رحمت آخرت صرف اہل ایمان کا مخصوص بالرحمت ہونا پایا جاتا ہے۔ اس لئے رحیم خاص ہے اور رحمٰن عام

چنانچہ امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم رحمٰن مختص بذات باری ہے۔ مگر اثر کے رو سے عام ہے۔ کیونکہ وہ اس اسم کے رو سے نیک و بد اور مومن و کافر سب کو شامل ہے اور اسم رحیم اطلاق میں عام ہے۔ کیونکہ ذات باری اور بندوں پر بولا جا سکتا ہے۔ مگر بلحاظ اثر کے خاص ہے کیونکہ رحمت آخرت کا ظہور صرف اہل ایمان کے لئے ہے۔ وزن رحمٰن کے مبنی بر مبالغہ ہونے پر یہ دلیل بھی جاری ہو سکتی ہے کہ اس کا وزن فعلان کا ہے۔ جیسے غضبان (بڑے غضب والا) سلآن (بڑا پر ہونے والا) شبعان (بڑا شکم سیر) مگر رحیم فعیل کا وزن ہے جو بسا اوقات مبنی فاعل کے ہوتا ہے۔ جیسے سمیع بمعنی سامع وغیرہ' مع ہذا کلمہ رحمٰن و رحیم ایک ہی مادہ سے مشتق ہیں۔ مگر رحمٰن کے حروف پانچ ہیں اور رحیم کے چار اس لئے ضروری ہے کہ رحمٰن کی بناء مبالغہ پر قائم کی گئی ہو برخلاف رحیم کے اور ایک روایت میں جو ابو سعید سے مروی ہے۔ مسیح علیہ السلام کی نسبت مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رحمٰن الدنیا اور رحیم الاخرۃ اس سے بھی مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لفظ رحمٰن و رحیم کی تحقیق میں اس سوال کا جواب بھی ضروری ہے کہ کیوں لفظ رحمٰن کو رحیم پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بتلایا کرتے ہیں کہ ہر سہ اسماء اللہ رحمٰن اور رحیم میں ہم جنس ہونے کو ملحوظ رکھا گیا ہے کیونکہ جس طرح اسم اللہ بجز ذات باری کے کسی پر اطلاق نہیں کیا جاتا اسی طرح اسم رحمٰن بھی بجز ذات باری عزاسمہ کے دوسرے پر اطلاق نہیں پاتا۔ برخلاف اسم رحیم کے چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا چونکہ اسم اللہ اور اسم رحمٰن میں ایک گونہ مشابہت تھی۔ لہذا ہر دو کو متصل بیان کرنا معنوی طور پر زیادہ قرین بلاغت ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

دوم رحمت عامہ جو مفہوم رحمان ہے۔ ہمزلہ اصل کے ہے اور رحمت خاصہ جو مفہوم رحیم ہے ہمزلہ زائد علی الاصل کے ہے اس لئے رحمٰن کا مقدم لانا ضروری تھا۔

امام غزالی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ اسم رحمٰن کا مقتضا جو مومن کو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بندگان خدا پر رحم کرے اور ان کی خیر خواہی میں لطف و کرم سے کام لے نہ درشتی اور سختی سے اور اہل معصیت کو بنظر رحمت دیکھے۔ بنظر اذیت اور ہر ایک معصیت جو عالم میں ظاہر ہو اس کو اپنی معصیت سمجھ کر اس کے دور کرنے میں پوری سعی جالائے۔ اہل معصیت عذاب الٰہی سے بچ جائیں اور اس رحیم کا مقتضی یہ ہے کہ جہاں تک اس کی طاقت میں ہو اہل فقر و فاقہ کی حاجت برآری میں کوتاہی نہ کرے۔ اور جس طرح ہو سکے بذریعہ مال یا بذریعہ شفاعت یا کسی دوسرے طریق پر اس کی حاجت و مصیبت کو رفع کرے۔ اور اگر کچھ قدرت نہ رکھتا ہو تو دعا سے کام لے۔ اور عدم قدرت اس طرح پر اندوہ زدہ ہو کہ وہ حاجت یا مصیبت خود اسی کی ذلت پر وارد ہے۔

تنبیہ

یہ خیال عام طور پر پیدا ہوا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہے۔ اور رحیم کا قاعدہ ہے کہ وہ صاحب قدرت ہونے کی صورت میں کسی مصیبت زدہ کو مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ اس کی مصیبت کو رفع کرتا ہے۔ مگر دنیا میں ہزاروں لاکھوں بندگان خدا انواع و اقسام کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کامل القدرت اور کامل العلم ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ ان مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبت کو دور نہیں کرتا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال صفات ذات باری میں غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ جو کچھ عالم کائنات میں ہو رہا ہے۔ نہایت عدل و حکمت پر مبنی ہے۔ دیکھو ماں اپنے بچہ کو عمل جراحی سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ مگر باپ جو انجام بینی سے کام لیتا ہے بچہ کو جراح کے حوالہ کر دیتا ہے۔ جو اس

پر اپنا عمل جراحی کرتا ہے۔ بظاہر ماں بچہ کی خیر خواہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر وہ در حقیقت بدان خیر خواہ ہے۔ اور باپ دشمن معلوم ہوتا ہے۔ مگر دراصل وہ بچہ کا بہترین خیر خواہ ہے کیونکہ اس کی نظر ایک ایسی مصلحت عظیم پر محدود ہوتی ہے جس کو ماں مد نظر نہیں رکھتی۔ اگر باپ بچہ کو جزی تکلیف سے بچانے کے لئے عمل جراحی سے اس کو محفوظ رکھے تو بچہ زخم کے ضرر سے ہلاک ہو جائے۔ اس تمثیل سے صرف یہ مقصود ہے کہ ایک مصلحت عظیمہ کی تکمیل میں جزئی تکلیف کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا فطرت عالم میں غور کرو کہ ہر ایک امر خیر کے ساتھ کس طرح جزی شر شامل ہے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کارخانہ حکمت میں حوادث کا وجود پذیر ہونا عین خیر پر مبنی ہوتا ہے مگر کسی حادثہ کے دوسرے اشیاء کے ساتھ متعلق ہونے پر شر جزی کو اس حادثہ میں دخل ہو جاتا ہے۔ باران رحمت نزول عین خیر ہے مگر کون کہتا ہے کہ اس میں جزی شر شامل نہیں ہوتا۔ انسان اپنی کوتہ نظری سے بسا اوقات شر جزی کو ملحوظ رکھ کر مصلحت عظیمہ کو نظر انداز کر جاتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ یعنی جن امور کو تم برا سمجھتے ہو انہیں میں تمہاری مصلحت مضمر ہوتی ہے۔ مگر سلسلہ اسباب کے ربط پر آگاہ نہ ہو کر تم انہیں ناپسند رکھتے ہو۔ الغرض کسی امر کے ذات باری سے صادر ہونے میں کوئی شر داخل نہیں۔ بلکہ محض خیر ہی صادر ہوتی ہے۔ مگر جب اس امر کو اپنے موارد خارجی سے تعلق ہوتا ہے تو وہی ایک امر بعض موارد کے حق میں تو عین خیر ہوتا ہے۔ اور دیگر بعض کے حق میں شر اور اگر جہت تعلق خارجی کو ہم نظر انداز کر دیں تو پھر شر کا وجود ہی ناپید ہے مطلب یہ کہ خیر مقصود بالذات ہے۔ اور شر مقصود بالعرض یہی وجہ ہے کہ کلام مجید میں بیدك الخیر ارشاد فرمایا نہ بیدك الخیر والشر

مذکورہ بالا اصل پر غور کرنے کے بعد اس امر کا سمجھ لینا ہرگز دشوار نہیں کہ کسی مصیبت زدہ کا مصیبت میں مبتلا ہونا ایک ایسے مخفی سلسلہ اسباب کے ربط کا نتیجہ ہے جس کو عوام الناس ہرگز اپنے ادراک میں نہیں لا سکتے۔ اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

بجز عارفان عالی مقام کے کسی کو اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر ربط اسباب کی حقیقت کا انکشاف اہل دنیا پر ہو جاتا تو سلسلہ کائنات کا انتظام کبھی درست نہ رہ سکتا۔ بلکہ ہزارہا مفاسد کا باعث ہوتا اور یہ امر حکمت ذات باری کے منافی ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ جب شر جزی کے بدون بھی امر خیر کا صدور ممکن تھا تو پھر خیر کے ساتھ شمول شر کی کیا ضرورت تھی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال بھی محض انسان کی عقل نارسا کا نتیجہ ہے کیونکہ کسی امر کے ممکن یا محال ہونے کا فیصلہ کر لینا کوئی سرسری بات نہیں جو لوگ اللہ تعالیٰ کے صفات متضاد کا علم رکھتے ہیں وہ آگاہ ہیں کہ عالم کائنات کی فطرت ہی ہر ایک قسم کے متضاد امور کی متقاضی ہے اور اسی سے اس کے کامل الصفات اور بے مثل ہونے کا ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ صدور حوادث کے اسباب اور ان کے روابط کا علم انداز عقل سے کہیں بالاتر ہے۔ ہاں مگر یہ محقق ہے کہ مقتضائے سبقت رحمتی غضبی امر خیر ارادہ الٰہی میں اولاً اور بالذات داخل ہے۔ اور امر شر ثانیاً اور بالعرض چونکہ اس حقیقت پر آگاہ ہونا ہے مسئلہ جبر و قدر کی بحث کا مقتضی لہٰذا اس دقیق مقام پر بجز سکوت کے کوئی چارہ نہیں اور زیادہ نکتہ چینی سے زوال ایمان کا خطرہ ہے۔ لہٰذا ہم ناظرین کو اسی قدر تفصیل پر قانع کرنا مناسب سمجھتے ہیں کیونکہ اس مسئلہ کی تہ تک پہنچنا ذوق و وجدان پر موقوف ہے۔ بحث و جدل کو یہاں دخل نہیں۔ فتدبر

واضح ہو کہ وصف رحمت مقام عبودیت کے کمال کا پتہ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام کو مختلف مواقع پر اس وصف سے متصف ظاہر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اور فرمایا بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اور پھر فرمایا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ اور خود حضور علیہ السلام نے صدیق اکبرؓ کی نسبت ارشاد فرمایا۔ ارحم امتی بامتی ابوبکر یعنی سب سے بڑھ کر میری امت کے حق میں ابوبکر رحیم ہیں۔ اور عام طور پر مقام تلقین رحمت میں ارشاد فرمایا الراحمون یرحمہم الرحمٰن ارحموا من فی

الارض یرحمکم من فی السماء یعنی رحمت کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحمت کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحمت فرمائے گا۔

استدعا رحمت کے متعلق حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کی نسبت مروی ہے کہ آپ عید فطر کے لئے مصلے کی طرف نکلے اور نماز کے بعد یوں دست بدعا ہوئے کہ خدایا مجھ پر رحم فرما کیونکہ تو نے فرمایا ہے۔ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ اور اگر میں محسنین میں شامل نہیں تو صالحین سے تو ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ وَالصّٰلِحِيْنَ وَالصّٰلِحٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا اور اگر میں صالحین میں بھی نہیں تو مومنین میں تو ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا اور اگر میں مومنین میں بھی نہیں تو تیری ایک پیدا کردہ شے ہوں۔ اور تو نے فرمایا ہے۔ رحمتی وسعت کل شیئ اور اگر میں یہ بھی نہیں تو میں مصیبت زدہ تیری رحمت سے محروم ہوں اور تو نے فرمایا ہے۔ اَلَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ غور کرو کہ اہل معرفت کو کس کس طریق پر بارگاہ رب العزت میں مناجات کرنے کا ڈھنگ تھا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت قرآن مجید کو سمجھتے اور اس سے منتفع ہوتے تھے۔ اللھم ارزقنا بحرمت نبی الرحمۃ وعلی الہ الطیبین

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ ذات باری اہل افکار کے لئے رحمان اور اہل انکار کے لئے رحیم ہے۔ جب اس کے جلال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ان کے عقول مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی طرف محتاج ہوتے ہیں اور جب اس کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو قوت حیات پاتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ اہل کہتے ہیں کہ وہ دنیا میں ستر گناہ کرتا ہے۔ اس لئے رحمن ہے اور آخرت میں مغفرت اور اس لئے رحیم ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا رحمن ہے کہ جب اس سے سوال کیا جائے تو عطا فرماتا ہے۔ اور آپ ایسا رحیم ہے کہ جب سوال نہ کیا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔ چنانچہ ابوہریرہؓ سے مروی ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ من لم یسئل اللہ یغضب علیہ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے سوال نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے۔ اسی خیال کو کسی صاحب دل نے یوں موزون کیا ہے۔

اللہ یغضب ان ترکت سوالہ

وابن آدم حین یسئال یغضب

ابوبکر وراق فرماتے ہیں رحمان بالاسماء ہے اور رحیم بالا لاء نعماء وہ ہے جو اس نے یہاں عطا فرما دیں اور آلاء وہ ہیں جن کی بابت اس نے خبر دی۔ محمد بن علی ترمذی لکھتے ہیں کہ وہ رحمان ہے۔ اس لئے کہ نار جہنم سے نجات عطا ہے اور رحیم ہے اس لئے کہ جنت میں داخل فرماتا ہے۔ حارث بن اسد محاسبی لکھتے ہیں کہ وہ رحمن ہے کیونکہ مصائب کو دور کرتا ہے اور رحیم ہے کیونکہ قلوب کو انوار و معرفت سے منور کرتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ وہ رحمن ہے کیونکہ اس نے قرآن مجید کی تعلیم فرمائی۔ حیث قال اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ اور رحیم ہے۔ کیونکہ تکریم و تسلیم کے ساتھ عزت افزائی کرتا ہے۔ حیث قال سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ بعض محققین نے لکھا ہے کہ اسم رحمٰن میں ایسی رحمت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ جو مخصوص بذات باری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر اللہ پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے۔ اور رحیم میں رحمت عامہ کی طرف اشارہ ہے جو غیر اللہ سے بھی صادر ہو سکے۔ اسی وجہ سے اس کا اطلاق غیر اللہ پر جائز ہے۔ مسیلمہ کذاب کے متبع مسیلمہ کو رحمن کہا کرتے۔ چنانچہ ان کا ایک شاعر کہتا ہے۔ فانت غیث الوری لازلت رحمانا مگر یہ محض جہل و جہالت و تعنت تھا نہ بطور حقیقت۔

خاصیت

الرحمٰن

ہر نماز کے بعد سو بار پڑھنے سے قلب کی غفلت اور نسیان دفع ہو اور

بکثرت اس کا ذکر کرنے والا ہر امر مکروہ سے محفوظ رہے اور اگر اس کو مشک و زعفران سے لکھ کر کسی محفوظ جگہ بد خلق کوی کے گھر میں دفن کر دیا جائے تو اس میں حیا اور ترحم اور سکنت پیدا ہو۔

الرحیم

جو شخص روزانہ سو بار پڑھے اس کے قلب میں رقت اور شفقت پیدا ہو اور جس کسی کو امر ناگوار کا اندیشہ ہو الرحمٰن الرحیم کی کثرت کرے یا لکھ کر باندھے اور اگر اس کو لکھ کر پانی سے دھو کر وہ پانی کسی درخت کی جڑ میں ڈال دیں اس کے پھل میں برکت ہو اور اگر کسی کو گھول کر پلا دے اس کے دل میں کاتب کی محبت پیدا ہو۔ اسی طرح اگر طالب و مطلوب کا نام مع والدہ کے لکھے اس کی محبت میں سرگرداں ہو بشرطیکہ جائز محبت ہو۔

دعاء

اعوذ بکلمات اللہ التامات التی لایجاوزھن برولا فاجر من شرما ینزل من السماء ومایعرج فیھا ومن شرما ذرافی الارض وما یخرج منھا ومن شرفتن اللیل وفتن النھار ومن شرطوارق اللیل والنھار الا طارقاً یطرق بخیر یا رحمن (حصن حصین)

والھکم الہ واحد لا الہ الا ھو الرحمن الرحیم (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمَلِكُ

جل جلالہ

اس باب سے مختلف اسماء کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ الملک مالک الملک والملکوت الملیک العالک مگر اسماء حسنیٰ میں صرف دو ہی اسم آئے یعنی الملک اور مالک الملک۔

لفظ ملک (بکسر میم) کی نسبت علمائے عربیت کے دو قول مروی ہیں۔ اول یہ کہ ملک کسی شے میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں۔ دوم یہ کہ ملک قدرت تصرف کو کہتے ہیں۔ ان ہر دو توجیہ میں جو فرق ہے۔ اسے علمائے متکلمین زیر بحث لاتے ہیں۔ جو محض لفظا مناقشات ہیں اور بے سود اصل لغت میں ملک بمعنی ربط اور شد کے ہے۔ قال الشاعر۔

ملکت بھاکفی فانھرت فتقھا
یری قائم من دونھا ماوراء ھا

(زخم کی فراخی کا ذکر کرتا ہے کہ میں نے زخم کے لئے اپنے ہاتھ کو نیزہ پر مضبوط کیا اور اس قدر فراخ زخم لگایا کہ اس طرف کا کھڑا ہونے والا زخم کی دوسری طرف کو دیکھ سکتا تھا)

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ربط اور شد کا مفہوم قدرت تامہ کا منافی نہیں۔ چونکہ قدرت تامہ کی مالک بجز ذات باری کے کوئی اور چیز نہیں اس لئے حقیقی طور پر انسان کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا لہذا ملک بمعنی سلطنت صرف ذات باری ہی کا وصف ہے اور بمعنی اور چونکہ تصرف فرع ہے ہر ملک کی اسی لئے عبد بالاستقلال مولیٰ کے مال میں کچھ تصرف نہیں کر سکتا آیۃ للہ الامر من قبل ومن بعد میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے ہاں عبد کو تملیک مولیٰ سے ایک عارضی تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقتاً اس کو مالک نہیں کہا جا سکتا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اسم ملک اور مالک ہر دو میں وصف کا یکساں مفہوم نہیں بلکہ اسم ملک میں مبالغہ ہے۔ کیونکہ ملک مملوکات کثیرہ کے مالک ہونے پر دال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مالک الدار یا مالک الفرس وغیرہ تو بول دیتے ہیں مگر ملک الدار اور ملک الفرس نہیں بول سکتے۔ معہ ہذا حضرت رب العزت اسم ملک اضافت سے اور نیز بلا اضافت دونوں طرح مستعمل ہے۔ اور مالک بجز اضافت مستعمل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اسم مالک اور ملیک بلحاظ مبالغہ وصف کے یکساں نہیں بلکہ بالاتفاق ان میں وہی نسبت جو ناصر و نصیر اور عالم و علیم اور قادر و قدیر وغیرہ میں یعنی اسم ملیک میں زیادہ مبالغہ ہے۔ اور اسم مالک الملک اسم مالک اور ملک ہر دو کے معنی پر مشتمل ہے۔ کیونکہ اضافت ملک کی مملوک ذات باری ہونے پر دال ہے اور ملک سے قدرت تامہ اور تصرف مراد ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ذات باری مالک قدرت و تصرف ہے۔ لفظ ملکوت' مالک بمعنی قدرت و تصرف کا مبالغہ ہے جیسے رغبت سے رغبوت اور رحمت سے رحموت وغیرہ اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ ملک اشارہ ہے ذات باری کے متصرف فی الاجسام ہونے کی طرف اور ملکوت سے عالم ملائکہ وارواح میں متصرف ہونا مراد ہے۔

یہ امر بذریعہ دلائل ثابت ہے کہ ذات باری مالک جمیع موجودات ہے اس لئے اگر ہم اس کے ملک کی تشریح کرنے لگیں تو ہمیں ایک ایک ذرہ کائنات کی حقیقت پر بحث کرنا ہوگی۔ جس سے ذات باری کے تصرف کامل کا ہم

toobaa-elibrary.blogspot.com

علم حاصل کر سکیں۔ مگر تمام موجودات زمینی و آسمانی کا خیال تو ہو سکتا ہے۔ اگر ہم مچھر یا کسی مکھی کے ایک پر کی تشریح کرنے لگیں تو اس کے متعلق مختلف مباحث کو طے کرنے میں ہزاروں لمبی لمبی عمریں ختم ہو جائیں۔ مگر ہم سمندر سے ایک قطرہ کے برابر بھی علم حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی عدم امکان کی طرف اشارہ ہوا۔ آیۃ لَوْكَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ (یعنی اگر تمام روئے زمین سمندر سیاہی بن جائیں جس سے موجودات ذات باری کی حقیقت قلمبند کی جائے تو یہ سیاہی ختم ہو جائے گی اور اللہ کی موجودات کا کبھی خاتمہ نہیں ہوگا) میں ہاں مگر بنظر اختصار و اجمال ہمیں آیۃ اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ الایۃ میں غور کرنا چاہئے۔

(ا) اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ان الفاظ سے ذات باری کا متصرف مطلق ہونا ثابت ہے۔ کیونکہ عطا اور منع ہر دو پر یکساں قادر ہے۔

(ب) وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ان الفاظ سے اعزاز و اذلال پر اس کا قادر ہونا ثابت ہے۔

(ج) تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ اس سے تقلیب لیل و نہار پر قادر ہونا ثابت ہے۔

(د) تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ان الفاظ سے اس کا احیاء و اماتت پر متصرف ہونا ثابت ہے۔

(ہ) وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ان الفاظ سے اس کا رازق مطلق ہونا ثابت ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا پانچ مواد سے ذات باری کا من کل الوجوہ قادر مطلق ہونا ثابت ہو رہا ہے اور ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ عبد کبھی دائرہ احتیاج سے باہر نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ممکن ہے اور ہر ایک ممکن محتاج ہے۔ سو جس طرح وہ کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا اسی طرح وہ کبھی کسی غیر اللہ کی طرف محتاج نہیں ہو سکتا کیونکہ غیر اللہ کو تصرف کا حق حاصل نہیں

اس لئے غیر خود محتاج ہے۔ پس محتاج کا محتاج ہونا عقلاً ممتنع ہے۔ ہاں عارضی طور پر ایک چیز غیر اللہ کی طرف محتاج ہے مگر فی الحقیقت سب کا محتاج الیہ ذات باری ہے۔ لہذا انسان کے مستغنی ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ جب وہ غیر اللہ سے بالکلیہ منقطع ہو کر محض اللہ تعالیٰ ہی کا ہو رہے۔ اور ہر ایک کی حاجت اسے مستغنی ہو جائے تو اس صورت میں ملک یا مالک مطلق ہو سکتا ہے۔ واضح ہو کہ اس مرتبہ کا مالک بجز ذات جامع کمالات جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی شخص نہیں ہوا اور اسی عدم احتیاج کی طرف اشارہ ہے۔ آیۃ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی میں ایک حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں۔

حیرت بین ان اکون عبدانبیاً اوملکا نبیاً فاخترت العبودیۃ

یعنی مجھے اس امر کا اختیار دیا گیا کہ میں عبد نبی ہو جاؤں یا ملک نبی سو میں نے عبودیت ہی کو اختیار کیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص من کل الوجوہ اپنے مولا کا بن کر رہتا ہے تو مولے خود اسی کا ہو جاتا ہے۔ اس لئے تمام مخلوقات اس شخص کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا نہیں بنتا کوئی چیز اس کی اطاعت نہیں کرتی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اصل ہر ایک چیز کی ذات باری سے ہے۔ جب اصل کسی کو حاصل ہو جائے تو فرع (جمیع مخلوقات) خود اس کی تابع ہو جائے گی۔ اور جب اصل سے محروم رہا تو فرع بھی اس سے زائل ہو گی اسی نکتہ کو حضور علیہ السلام نے اس حدیث میں ظاہر فرمایا ہے اذا سئلت فاسئال اللہ واذاستعنت فاستعن باللہ یعنی جب سوال کرو تو اللہ تعالیٰ سے اور جب مدد مانگو تو اسی سے۔

دوم یہ کہ قلب بمنزلہ ایک سلطنت کے ہے۔ جس میں سلطان روح حکومت کرتا ہے۔ اور نفس اس کا دشمن ہے اور ان دونوں میں ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے وزیر عقل سلطان روح کی طرف سے اور وزیر جہل سلطان نفس کی طرف سے باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ سلطان روح مملکت قلب میں اخلاق حسنہ نورانیہ کا لشکر پھیلانا چاہتا ہے۔ اور سلطان نفس عادات قبیحہ ظلمانیہ کا اور ہر دو کو بیرونی

toobaa-elibrary.blogspot.com

امداد بھی ہوتی رہتی ہے۔ یعنی سلطان روح کی امداد کے لئے ملائکہ اور سلطان نفس کی امداد کے لئے شیاطین علیحدہ علیحدہ اپنا کام کرتے ہیں۔ ان دونوں لشکروں میں خوب مقابلہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر اگر عنایت الٰہی سلطان روح کے شامل حال ہو جائے تو سلطان نفس کا لشکر شکست پا کر مملکت سے خارج ہو جاتا ہے۔ ورنہ شیاطین کی حکومت غالب آکر مملکت قلب میں مختلف قسم کی خرابیاں ڈال دیتی ہیں۔ اور شہوت و غضب اور حرص و حسد وغیرہ کے سوا اور کسی چیز کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔

اس مثال میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ سلاطین عالم میں تو اس قسم کا مقابلہ کبھی شاذ و نادر ہوا کرتا ہے۔ مگر روح اور نفس میں ہر وقت یہ مخاصمہ جاری رہتا ہے اکثر ایسا ہوا کرتا ہے کہ کبھی سلطان روح کو غلبہ ہو جاتا ہے اور کبھی سلطان نفس کو' یہی وجہ ہے کہ ایک ہی شخص کبھی تو مشابہ ملک آسمانی ہو جاتا ہے اور کبھی وہی شخص ثانی شیطان اور بجز عنایت الٰہی اور رحمت ازلی کے کوئی چارہ نہیں اسی خیال پر انبیاء علیہم السلام کے ادعیہ میں حضور باری عزاسمہ التجا رحمت مروی ہے۔ خلیل علیہ السلام کی دعا میں غور کرو۔ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ یعنی خدایا مجھے حکمت دے۔ اور اہل صلاح کے ساتھ ملا دے حکمت کی استدعا سے مراد یہ ہے کہ مقابلہ نفس کی طاقت دے جس کا نتیجہ صلاح و تقوی ہو سکتا ہے۔ کلیم علیہ السلام کی دعا کو دیکھو رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْ اَمْرِيْ یعنی خدایا میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے اور میرے امر میں مجھے آسانی دے۔ اس دعا میں شرح صدر سے مراد یہ ہے کہ میرے قلب سے آلائش جہل کو بالکل دور کر دے۔ جس کا نتیجہ تجلی اور عظمت ہے اور امر میں آسانی دینے سے مراد یہ ہے کہ نفس اور شیطان کے مغلوب کرنے کی قوت عطا فرما جس کا نتیجہ قلب کا انوار معرفت سے منور ہونا ہے اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضور نبی ہی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں غور کرنا چاہئے۔ حیث قال اللہ تعالی تعلیماً له صلی اللہ علیه وسلم وقل

رب اعوذبك من همزات الشياطين واعوذبك رب ان يحضرون یعنی خدایا میں شیاطین کی اندرونی رہزنوں سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نیز میں اس امر سے کہ شیاطین میرے پاس آسکیں۔ تیری پناہ میں آتا ہوں اس موقع پر قابل ضبط امر یہ ہے کہ جو شخص قلب کے ان حالات کا عارف ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت غیر اللہ سے اپنے تعلق کو قطع کرنے کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اپنے تئیں اس مولائے حقیقی کے سپرد کر دیتا ہے اور غیر سے اپنی امید منقطع کر لیتا ہے اور آفات و علائق سے بچا رہتا ہے اسی امر کی طرف بعض مشائخ نے یوں ارشاد فرمایا ہے کہ ايجمل بالحر المريد ان يتذلل للعبيد وهو يجد من مولاه مايريد یعنی کسی خاص الارادت طالب کو ہرگز شایاں نہیں کہ عاجز بندوں کے سامنے فروتنی کا اظہار کرے۔ جبکہ وہ اپنی ساری مرادیں اپنے مولیٰ سے حاصل کر سکتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ مقام بہت اونچا ہے۔ اور ہر ایک ہوس ناک کو وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

سفیان بن عیینہؒ سے مروی ہے کہ میں بیت اللہ کا طواف کر رہا تھا کہ یکایک مجھے ایک شخص نظر پڑا۔ اسے دیکھتے ہی میرے دل نے فیصلہ کر لیا کہ یہ شخص ضرور مخلصین میں سے ہوگا۔ یعنی اس کے قریب جا کر عرض کیا کہ آپ مجھے کچھ وصیت فرمائیں جس سے میں فائدہ اٹھاؤں اس نے مجھے جواب نہ دیا اور طواف میں لگا رہا۔ جب طواف سے فارغ ہو چکا تو مقام ابراہیم کے پیچھے اس نے دوگانہ ادا کیا اور پھر حجر (گرداگرد کعبہ اندرون حطیم از سوئے شمال) میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اس کے پاس جا بیٹھا اور پھر وہی مذکورہ بالا عرض کی۔ تب اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ کیا تو جانتا ہے کہ تیرے رب نے کیا حکم دیا ہے یہ کہہ کر خود ہی فرمایا کہ رب العالمین نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں حی لایموت ہوں میری اطاعت کرو۔ میں تمہیں بھی مالک الملک بنا دوں گا۔ میں وہ بادشاہ ہوں کہ جب کسی کو امر کرنا چاہتا ہوں تو وہ امر میرے ارادہ کے ساتھ ہی واقع ہو جاتا ہے۔ میری اطاعت کرو۔ میں تمہیں بھی ایسا بنا دوں گا کہ جب تم کسی امر کا ارادہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

کرو گے وہ امر اسی وقت موجود ہو جائے گا۔ اتنا کہا اور وہ بزرگوار میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے میں حیران رہ گیا اور سمجھا کہ خضر علیہ السلام تھے۔

بعض حکایات میں مروی ہے کہ کسی امیر نے ایک خدا دوست صالح مرد کو کہا کہ اگر کوئی حاجت ہو تو مجھ سے فرمایئے۔ انہوں نے کہا کہ میرے پاس جو دو غلام ہیں وہ تمہارے حاکم ہیں بھلا میں اپنے غلام کے غلام سے کیوں اپنی حاجت روائی کر سکتا ہوں۔ اس امیر نے عرض کیا کہ وہ کون سے دو غلام ہیں۔ اس مرد خدا نے جواب دیا۔ کہ شہوت اور غضب یہ ہر دو تیرے تو حاکم ہیں مگر میرے محکوم ہیں۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ سورۃ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے حکایۃ آیۃ رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ میں ملک سے قدرت علی النفس مراد لی ہے اور وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ میں تاویل احادیث سے حکمت گویا ہر دو آیات علیحدہ علیحدہ قوت عملی اور قوت نظری کے کمال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ قال الشاعر۔

من ملك النفس فحر ماهو والعبد من يملكه هواه

(آزاد وہی ہے جو نفس پر قادر ہے اور غلام وہ جس پر خواہش نفس حکمران ہو)

خاصیت

جو شخص زوال کے وقت ایک سو بیس بار پڑھا کرے اللہ تعالیٰ اس کو صفائی قلب اور غنا عطا فرمائیں خواہ غناء ظاہری ہو یا غنا باطنی۔

دعاء اللهم انت الملك لا اله الا انت سبحانك انت ربى وانا عبدك ظلمت نفسى و اعترفت بذنبى فاغفرلى ذنبى جميعاً انه لا يغفر الذنوب الا انت واهدنى لاحسن الا خلاق لايهدى لا حسنها الا انت واصرف عنى سيئها لا يصرف عنى سيئها الا انت لبيك وسعديك وانا بك واليك لا منجى منك ولا ملجا الا اليك استغفرك واتوب اليك (ترمذی)

اَلْقُدُّوْسُ

جل جلالہ

اس اسم کے متعلق چند مسائل ضروری البیان ہیں۔ اول یہ کہ یہ اسم لفظ قدس سے مشتق ہے۔ جس کے معنی طہارت اور نزاہت کے ہیں۔ چنانچہ بیت المقدس کی وجہ تسمیہ بھی اسی مناسبت پر مبنی ہے۔ جنت کو حظیرۃ القدس بولتے ہیں۔ کیونکہ آفات دنیا سے پاک ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو روح القدوس کہا گیا ہے کیونکہ تبلیغ وحی میں غلطی اور عیب سے پاک ہیں۔ بعض اہل لغت نے لکھا ہے کہ کلام میں بجز قدوس اور سبوح اور ذروح اور فروح کے سب اسماء فعول بالفتح آئے ہیں۔ مگر یہ چاروں بالضم ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ اصل میں سریانی زبان کا ہے۔ چنانچہ قدیس کا لفظ جو اہل کتاب کی ادعیہ میں وارد ہے۔ اس امر پر کافی حجت ہے۔

اسماء ذات باری میں یہ اسم اس مفہوم پر مشتمل ہے کہ وہ ذات بیچون تمام نقائص و عیوب سے بری ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ القدوس هو المنزه عن كل وصف من اوصاف الكمال الذى يظنه اكثر الخلق كمالا یعنی قدوس وہ ذات ہے جو ان تمام اوصاف کمال سے بری ہو۔ جس کو اکثر

toobaa-elibrary.blogspot.com

لوگ کمال خیال کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ عوام الناس بلکہ اکثر علماء جو درجہ سیر مقامات تک رسائی نہیں رکھتے۔ صفات ذات کو انسانی صفات پر قیاس کر لیا کرتے ہیں۔ مثلاً وہ انسانی علم و قدرت اور سمع و بصر وغیرہ کو ذات باری کے علم و قدرت وغیرہ صفات کے ادراک میں معیار قرار دے لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ذات گرامی جہل سے جو ضد علم ہے اور عجز سے جو ضد قدرت ہے پاک ہے۔ حالانکہ حق یہ ہے کہ وہ ذات مقدس ان صفات علم و قدرت سے بھی بالاتر ہے۔

جن کو ہم انسانی ادراک کی رو سے سمجھ سکتے ہیں لہٰذا عام لوگ شاہ ذات باری میں علیم و قدیر اور سمیع و بصیر سے وہی مفہوم سمجھا کرتے ہیں جو انسان کے صفات کے لئے سمجھنا چاہئے۔

بعض مشائخ کرام نے لکھا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو حاجات سے پاک ہو اور جس کی صفات آفات سے بری ہو اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو ابرار صالحین کے نفوس کو آلائش معصیت سے پاک کرتی ہے بعض دیگر اکابر نے لکھا ہے کہ قدوس وہ ذات ہے جو احتیاج زمان و مکان سے بالاتر ہو اور بعض حضرات نے یوں تعبیر کی ہے کہ قدوس وہ ذات ہے کہ اپنے اولیاء کے قلوب کو ہر ایک قسم کے مالوفات پر مطمئن ہونے سے پاک کرتا ہے اور انوار مکاشفات سے ان کے ارواح کو انس عطا فرماتا ہے۔

اس مقام پر اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ذات باری کے ماسوا تمام موجودات دو قسم پر منقسم ہے اول ذوات دوم صفات پھر ذوات کی دو قسمیں ہیں اول مجردات دوم جسمانیات سو مجردات سب سے اشرف ہیں اور صفات بھی دو قسم کے ہیں عقلی اور حسی ان میں سے عقلی شرف ہیں کیونکہ وہ دوام و بقا رکھتی ہیں۔ اور حسی متغیر ہوتی رہتی ہیں اس لئے انسان کا تقدس اس امر پر مبنی ہے کہ لذات جسمانیہ سے منہ پھیر لے اور امور مادیہ میں مشتغل ہونے سے کنارہ کش ہو جائے بلکہ واجب یہ ہے کہ علوم حقیقیہ روحانیہ اور اخلاق حمیدہ کے حاصل

کرنے پر اپنی توجہ مبذول کرے اور یہ امر جب حاصل ہو سکتا ہے جب کہ خیر و سعادت کی حقیقت کا اسے پورا پورا علم حاصل ہو۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ قدوس وہ ذات ہے جس کو ہم تصور اور خیال یا وہم سے ہرگز ادراک نہیں کر سکتے وہ قدوس کے معنی یہ نہیں لیتے کہ وہ ذات جو نقائص و عیوب سے پاک ہو کیونکہ اس ذات گرامی کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ نقائص و عیوب سے بری ہے ایک قسم کا سوء ادب ہے مثلاً اگر ہم یوں کہیں کہ بادشاہ ملک جولاہ اور حجام نہیں تو مقابلہ رتبہ سلطنت یہ طرز بیاں بھی ایک قسم کی بے ادبی ہے خاکسار کہتا ہے کہ امام صاحب کا خیال نہایت وزنی اور قیمتی ہے اور اس کو اہل باطن کے سوا کوئی شخص کما حقہ نہیں سمجھ سکتا ادب ہی تمام ترقیات کا زینہ ہے اور بس۔

خاصیت

بعد نماز جمعہ کے ایک سو پچاسی بار سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح کہہ کر پھر اس کو ایک روٹی پر لکھ کر جو شخص کھاوے تمام آفات سے محفوظ رہے اور توفیق عبادت ہو۔

دعاء

سبحان الملک القدوس، سبحان الملک القدوس، سبحان الملک القدوس۔ رب الملئکہ والروح (حصن حصین)

سبوح قدوس رب الملئکۃ والروح (حصن حصین)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلسَّلَامُ

جل جلالہ

سلام بمعنی سلامت ہے قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ اس آیت میں دارالسلام سے جنت مراد ہے کیونکہ جنت میں جانے والا شخص موت اور آفات دنیا سے بچ جائیگا۔ اسی معنی پر جملہ السلام علیکم کا مفہوم قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کلام پاک میں یحییٰ علیہ السلام کے حق میں فرماتے ہیں وَسَلَامٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا اس آیت کے متعلق سفیان بن عیینہ رحمتہ اللہ علیہ ایک عجیب معنے ارشاد فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ انسان کے لئے تین مواقع سخت وحشت اور تشویش کے ہیں اول جس دن پیدا ہوتا ہے بوجہ ایک غیر معمولی نقل مکانی کے نہایت متوحش ہوتا ہے لہٰذا شیطان ہر ایک بچہ کو پیدا ہونے پر مس کرتا ہے دوم جس دن مرتا ہے اسے ایک عجیب و غریب قوم سے پالا پڑتا ہے یعنی ملائکہ جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا اس لئے وہ اس موقع پر بھی سخت پریشان ہوتا ہے سوم جس دن اس کا حشر ہوگا یہ موقع بھی نہایت اضطراب و سراسیمگی کا ہوگا سو اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کی

نسبت ان ہر سہ مواقع پر آفات سے باسلامت رہنے کا ذکر فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ وہ ان ہر سہ مواقع پر خوف اور ہراس سے محفوظ رکھے گئے ہیں قول صواب کو بھی قرآن مجید میں سلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے حیث قال اللہ تعالیٰ وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا اس سے معلوم ہوا کہ سلام وہ قول ہے جو عیب اور گناہ سے پاک ہو۔

چونکہ مذکورہ بالا حوالہ جات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلام بمعنی سلامت ہے اس لئے اسماء ذات باری میں اس کے معنی ذواسلام کے ہونگے یعنی ایسی ذات جو نقائص سے محفوظ ہو اور بطریق مبالغہ مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں لیا گیا ہے جیسے رجل عدل ای ذو عدل اور رجل غیاث ای ذوغیاث یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ سلام اور قدوس میں کیا فرق ہے اس کا جواب یہ ہے کہ قدوس سے زمانہ ماضی اور حال میں بری از عیوب ہونا پایا جاتا ہے اور سلام میں یہ اشارہ ہے کہ زمانہ مستقبل میں وہ محفوظ رہے گا اور بعض محققین نے لکھا ہے کہ اسم قدوس صفات میں نقص سے بری ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اسم سلام افعال میں نقص سے بری ہونے پر بعض مفسرین نے سلام کے معنی یہ کئے ہیں کہ سلام وہ ذات ہے جو دوسروں کو سلامت بخشے اور یہ امر مبدء و معاد ہر دو کو شامل ہے مبدء کے متعلق تو فرمایا مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی اکثر مخلوقات کو عیوب سے بری پیدا کیا ہے اور معاد کے متعلق فرمایا وَمَا رَبُّکَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو ظلم سے باسلامت رکھنے کا وعدہ فرما لیا ہے بعض اہل تحقیق نے سلام بمعنے مسلم لیا ہے یعنی وہ ذات جو قیامت کو اپنے بندوں پر سلام بھیج کر ان کی عزت افزائی کریگی۔

(یہ فرق صرف انسانی حالات کے رو سے بتایا گیا ہے۔ ورنہ ذات باری کی نسبت زمانہ ماضی اور حال اور استقبال یکساں ہیں۔ کیونکہ وہ ذات اقدس تعلق زمانہ سے بری ہے ۱۲ منہ)

toobaa-elibrary.blogspot.com

قال اللہ تعالیٰ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ

حضرات مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس اسم کا مقتضی انسان کامل کے لئے یہ ہے کہ وہ نفس کی ظاہری اور باطنی مخالفت سے محفوظ ہو جاوے قال اللہ تعالیٰ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ اس اسم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بندہ ذنوب سے محفوظ اور عیوب خفیہ سے بری ہو جائے قال اللہ تعالیٰ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ اس آیت میں قلب سلیم سے مراد ایسا قلب ہے کہ جو شرک و نفاق سے بالکل خالص اور شک و شقاق سے بالکل فارغ ہو جائے یا یوں کہو کہ قلب سلیم وہ ہے جس کا نفس شہوات اور شبہات سے پاک و صاف ہو جائے الغرض اسلام کا ثمرہ اسم سلام سے یہ ہے کہ دنیا میں تو تمام موذی چیزوں سے محفوظ ہو اور اپنی حاجات میں غیر محتاج اور دین میں اس کا باسلامت ہونا یوں ہے کہ مقام شریعت میں بدعت اور شبہات اور ہوا اور شہوت سے بری ہو اور مقام طریقت میں یوں کہ شہوات اور غضب کو قوت عاقلہ کی حکومت سے باہر نہ ہونے دے اور ہر دو کو اپنا مغلوب رکھے اور مقام حقیقت میں یوں کہ غیر اللہ کی طرف اس کو مطلقاً التفات نہ رہے قال اللہ تعالیٰ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اس اسم کے ذیل میں فرماتے ہیں ولن یوصف بالسلام والاسلام الامن سلم المسلمون من لسانه ویده فکیف یوصف به من لم یسلم هو من نفسه حتی وصف سلام اور اسلام سے صرف وہی شخص موصوف ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور جس شخص کو ابھی قید نفس سے رہائی نصیب نہیں ہوئی اس کو یہ مقام کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

خاصیت

اگر مریض کے پاس اس کے سرہانے بیٹھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کو ایک سو چھتیس بار بلند آواز سے کہ مریض بھی سن لے پڑھیں ان شاء اللہ اس کو شفا ہو۔

اَلْمُؤْمِنُ

جل جلالہ

اس اسم شریف کے متعلق لغوی تحقیق یہ ہے کہ یہ اسم مصدر ایمان سے مشتق ہے جس کے معنی یا تو تصدیق کے ہیں قال اللہ تعالیٰ وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ای بمصدق لنا یا امان دینے کے جو خوف دلانے کا ضد ہے قال اللہ تعالیٰ وَاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ چنانچہ اکثر محققین نے ایمان کی اصل امان ہی قرار دی ہے ان ہر دو ماخذ کے سمجھ لینے پر اسم مومن کے معنے بھی ہر دو صورت میں تحقیق کرنا ضروری ہے سو جب ہم مومن کو معنے مصدق (تصدیق کنندہ) لیں تو اس کی چند وجوہ قرار دی جا سکتی ہیں اول یہ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات مقدس کی وحدانیت کی بابت دی ہے اس نے اس کا یہ خبر دینا بمنزلہ تصدیق کے سمجھا گیا اور یہ تصدیق عین ایمان ہے قال اللہ تعالیٰ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ہاتھوں پر معجزات ظاہر کئے ہیں اور اظہار معجزہ اللہ تعالیٰ کے صفات افعال میں سے ہے جس کی تصدیق خود اس نے بالفاظ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کلام پاک میں فرما دی

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس لئے یہ تصدیق ذات باری عین ایمان ٹھہری۔

سوم اسم مومن کے معنے مصدق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ان وعدوں کی تصدیق کریگا جو اس نے اہل ایمان کے لئے فرشاد فرمائے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ۔ جَزَاءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ یہ وعدہ عالم آخرت میں پورا ہو گا اور پھر فرمایا وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا یہ وعدہ عالم دنیا میں پورا ہو رہا ہے۔

چہارم اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کے متعلق وعدہ فرمایا ہے۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ چونکہ اللہ تعالیٰ اس وعدہ کی تصدیق فرماتا ہے اس لئے مومن معنے مصدق قرار پایا۔

اور اگر اسم مومن کو بمعنی امان دہندہ قرار دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کے مصائب اور عالم آخرت کے عذاب سے امان دینے والا ہے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امان دینے سے مراد خوف کا دور کرنا ہے اور خوف کا دور کرنا تب ہی متصور ہو سکتا ہے جبکہ خوف کا کوئی موقع متوقع ہو اور ایسا موقع کسی قسم کے نقصان یا ہلاکت کے وقت ہو سکتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ نقصان یا ہلاکت کو دور کرنے والا بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں لہٰذا امن دینے والا بھی فی الحقیقت بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں ہو سکتا اس کو مثال میں یوں سمجھنا چاہئے کہ نابینا آدمی بوجہ عدم بصارت اپنے ہلاک ہو جانے سے ڈرتا رہتا ہے اور اگر اس کے پاس بصارت ہوتی تو اسے ڈر نہ ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ بصارت نابینا کے حق میں خوف ہلاک کے دور ہو جانے کا ذریعہ تھا اسی طرح لنجا آدمی ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے اپنے ہلاک ہو جانے کا ڈر رکھتا ہے اگر اس کا ہاتھ سالم ہوتا تو خوف ہلاک سے اس کو امان حاصل ہوتی علیٰ ہذا القیاس جمیع حواس اور اعضاء کی نسبت ہم ایسا ہی خیال کر سکتے ہیں چونکہ حواس اور اعضاء کا خالق وہی ذات مقدس ہے اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ اسی ذات مقدس نے یہ اسباب پیدا کر کے ہم کو خوف سے امان دی ہے اسی

طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص دل میں اپنے دشمن سے خوف رکھتا ہے مگر ضعف کی وجہ سے حرکت نہیں کر سکتا اور اگر حرکت کر سکتا ہو تو ممکن ہے کہ کوئی ہتھیار اپنے پاس نہ رکھتا ہو اور اگر ہتھیار بھی اس کے پاس ہو تو ممکن ہے کہ تنہا دشمن کا مقابلہ نہ کر سکتا ہو اور اگر بالفرض اس کے پاس سپاہ کی جمعیت بھی ہو تو پھر بھی اس کو دشمن کے آنے کا خوف دامن گیر ہو گا اس لئے وہ اپنے معاونین کے مشورہ سے قلعہ اور خندق کا انتظام کرنے پر مجبور ہو تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ اپنی کوشش کے مطابق دشمن کے خوف سے امن پا جائیگا لہٰذا وہی ذات مقدس جس نے اسباب مذکورہ بالا کو پیدا کیا ہے امان دہندہ قرار پائے گی اسی طرح بھوک پیاس بیماری کے لئے اس نے اغذیہ اور ادویہ پیدا کر دی ہیں جن سے ہم ہلاکت سے امان پا جاتے ہیں اب عالم آخرت کے متعلق بھی اس ذات کا امان دہندہ ہونا ظاہر ہے کیونکہ بذریعہ دلائل و براہین کے اس نے حقیقت توحید کی وجہ ثبوت پر آگاہ فرما دیا ہے سو جو شخص معرفت توحید حاصل کر لیتا ہے وہ عالم آخرت کے عذاب سے امن میں ہو جاتا ہے چنانچہ حدیث قدسی میں ارشاد ہوا ہے لا اله الا الله حصنی من دخل حصنی امن من عذابی یعنی توحید میرا قلعہ ہے جو شخص میرے قلعہ میں داخل ہو گا میرے عذاب سے امن پا جائیگا اس تقریر سے معلوم ہوا ہے کہ امن و امان در حقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں لہٰذا حقیقی مومن وہی ذات مقدس ہے اور بس۔

فائدہ

اگر کوئی شخص یہ اعتراض پیش کرے کہ خوف بھی تو بجز اللہ تعالیٰ کے حقیقۃً کسی غیر کی طرف سے نہیں ہو سکتا پس امن جو خوف کا ضد ہے اس کی طرف سے کیسے ہو گا؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا امن دہندہ ہونا ہرگز اس کے خوف دہندہ ہونے کا مانع نہیں کیونکہ وہ معز بھی ہے اور مذل بھی اور محی بھی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے اور ممیت بھی اعتبارات علیحدہ علیحدہ ہیں۔

تنبیہ

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ مخلوق خدا کے لئے ہر ایک طرح سے موجب امن و آسائش ہو جاتا ہے خواہ دنیا کے متعلق ہو جیسے کہ کسی مصیبت زدہ کی دستگیری اور امداد خواہ عالم آخرت کی بابت جیسے خلق اللہ کو تبلیغ شریعت کر کے عذاب سے بچانا جو انبیاء علیہم السلام کا فرض ہے اور علمائے امت ان کے وارثان کہلاتے ہیں۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن ایک پکارنے والا پکارے گا کہ جو شخص کسی نبی کے نام سے ہمنام ہے جنت میں داخل ہو جائے چنانچہ یہ سنتے ہی ایسے لوگ داخل جنت ہو جائیں گے اور جو لوگ پیچھے رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ تم لوگ کون ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم مومنین ہیں مگر ہمارے نام کسی نبی کے نام سے ہمنام نہیں تب اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ میں بھی مومن ہوں اور تم بھی مومن ہو جاؤ میری رحمت سے داخل جنت ہو جاؤ۔

خاصیت

جو بکثرت اس کا ذکر کرے اس کو امن اور قوت ایمان ہو اور اگر خوف زدہ ہو۔ اس کو چھتیس بار کہے اپنی جان و مال میں مامون ہو۔

قرآنی آیت

هو الله الذی لا اله الا هو عالم الغیب والشهادة هو الرحمن الرحیم هو الله الذی لا اله الا هو الملك القدوس السلام المومن المهیمن العزیز الجبار المتکبر سبحن الله عما یشرکون هو الله الخالق البارئ المصور له الاسماء الحسنی یسبح له ما فی السموات والارض وهو العزیز الحکیم

اَلْمُهَیْمِنُ

جل جلالہ

اس اسم کی تفسیر میں دو قول ہیں اول یہ کہ ابو زید نحوی اس لفظ کو غیر عربی قرار دیتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کے نزول سے پہلے اہل عرب میں اس کا استعمال نہیں تھا بلکہ یہ سریانی لفظ ہے جس کے آخر میں حرف مدہ ہے یعنی مھیمنا کہہ کر بولتے ہیں جیسا کہ اس زبان کا عام قاعدہ ہے اور اس کے معنی مومن صادق الایمان کے ہیں مگر یہ مذہب صحیح نہیں دوم اہل کلام کا مذہب ہے جو اس کو عربی الاصل مانتے ہیں اور اس کی تفسیر میں چند وجوہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اول یہ کہ مھیمن بمعنے شاہد کے ہے چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

ان الکتاب مهیمن لنبینا والحق یعرفه اولو الالباب

اس تفسیر کے رو سے اس اسم کی توجیہ یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اقوال و افعال کا شاہد ہے چنانچہ ارشاد فرمایا کنا علیکم شهوداً سو مھیمن کے یہ معنے ہوئے کہ مھیمن وہ ذات ہے جو تمام معلومات پر حاوی ہو اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اس کے احاطہ علم سے خارج نہ ہو دوم یہ کہ مھیمن دراصل مومن ہے ہمزہ کو ہاء سے بدلا گیا ہے جیسے کہ اکثر الفاظ میں ایسا واقع

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہوا ہے مثلاً ھیہات ھیہات وھیاک وایاک سوم خلیل بن احمد کا قول ہے کہ مھیمن بمعنے رقیب و حافظ کے ہے اہل عرب بولا کرتے ہیں ھیمن فلان علی کذا اذا کان محافظاً علیہ چہارم مبرد نحوی کہتا ہے کہ عرب لوگ اپنے محاورہ میں بولا کرتے ہیں قد ھیمن الطائر یعنی پرندہ نے اپنے آشیانہ کے گرد اپنے بازو اور پر پھر پھرائے۔ تاکہ اپنے چوزوں پر سے کسی چیز موجب اذیت کو دفع کرے اس لئے اس لفظ کے معنی مشفق دل سوز کے ہوئے پنجم حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مھیمن کے معنی مصدق (تصدیق کنندہ) کے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کی بوجہ معجزات کے تصدیق کرتا ہے اس لئے وہ مھیمن ہے ششم امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مھیمن اس ذات کا نام ہے جو مجموع صفات ثلاثہ کی جامع ہو۔

(1) علم کامل باحوال شے

(2) قدرت کاملہ کسی شے کے مصالح کی بابت

(3) ان مصالح کا بہ طریق دوام جاری رکھنا جس ذات میں یہ ہر سہ صفات موجود ہوں گے وہ مھیمن کہلائے گی سو ایسی ذات صرف ذات باری ہی ہے بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ مھیمن کتب قدیمہ سماویہ میں ذات باری کا اسم ہے حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ مھیمن وہ ذات ہے جو ظاہر و باطن پر آگاہ ہو نور مخلوق کے شکر و شکایت کو سنے اور بلاؤ مصیبت دفع کرے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلب کے خواطر کا پاسبان اور اصلاح حالات کا نگران رہتا ہے جب اسے خود کامل ترقی ہو جاتی ہے تو لوگوں کے ظواہر و باطن پر آگاہ ہو کر ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

خاصیت

غسل کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر سو بار رات میں بحضور قلب پڑھیں تو عالی ہمتی پیدا ہو۔

اَلْعَزِیْزُ

جل جلالہ

اللہ تعالیٰ نے کتاب کریم میں صفت عزت کو اپنے لئے ثابت کیا ہے قال اللہ تعالیٰ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ اور ابلیس نے رب العزت کی قسم کھاتے ہوئے کہا فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اور اس کے اشتقاق لغوی میں چند وجوہ بیان کیا کرتے ہیں اول جبکہ عزیز کے معنی بے مثل و بے نظیر ہوں تو اس کا اشتقاق عزالشئی یعز سے ہوگا جس کے معنی کسی چیز کے کمیاب ہونے کے ہیں جب کہ اس کی تلاش کی جائے عرب والے بولا کرتے ہیں عزالطعام فی البلد جب کہ سامان معیشت شہر میں نہ مل سکے سو جب مخلوق بوجہ نایاب ہونے کے عزیز کہلا سکتا ہے تو ذات باری جس کا مثل عقلاً محال ہے بدرجہ اولیٰ عزیز کہلانے کی مستحق ہے۔

دوم عزیز بمعنی غالب اس صورت میں عزیز سے مشتق ہوگا جس کے معنی ہیں غلب کے ہیں قال اللہ تعالیٰ وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ای غلبنی اہل عرب بولا کرتے ہیں من عزیزای من غلب سلب سو جب ایک عاجز مخلوق اپنے حریف پر غالب آکر عزیز کہلا سکتا ہے تو ذات باری سبحانہ و تعالیٰ جو

toobaa-elibrary.blogspot.com

کبھی مغلوب نہیں ہوتی بدرجہ اولے عزیز کہلانے کی مستحق ہو گی۔

سوم عزیز بمعنی شدید قوی اس صورت میں عزیز سے مشتق ہو گا جس کے معنی شدید قوی ہونے کے ہیں قال اللہ تعالیٰ فعززنا بثالث یعنی ہم نے تیسرا رسول بھیج کر پہلے دو کو تقویت بخشی موجب ایک عاجز مخلوق کو بلحاظ اس کی شدت وقوت کے عزیز کہہ سکتے ہیں تو ذات باری جو عجز سے بالاتر ہے بدرجہ اولے عزیز ہو گی۔

چہارم عزیز بمعنے معز جیسے الیم بمعنے مولم اور وجیع بمعنے موجع اس لئے عزیز کے معنی ہوئے عزت دہندہ۔

واضح ہو کہ معنی اول کے رو سے اس اسم سے مفہوم تنزیہ ظاہر ہوتا ہے اور معنی ثانی اور ثالث کے رو سے عزیز مجملہ صفات ذات کے ہو گا اور معنی رابع کے رو سے مجملہ صفات فعل کے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عزیز وہ ذات ہے جس کا مثل کمیاب ہو اور اسی کی طرف بغایت احتیاج ہو اور اس تک رسائی دشوار ہو یہ ہر سہ صفات مجموعی طور پر جب تک کسی موجود میں جمع نہ ہوں عزیز نہیں کہلا سکتا کیونکہ کئی ایک ایسی اشیاء بھی ہوتی ہیں جو کمیاب تو ہوتی ہیں مگر ان کی طرف احتیاج نہیں پڑتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا مثل نہیں ہوتا اور اس کی طرف سخت احتیاج ہوتی ہے مگر اس تک رسائی دشوار ہوتی ہے ایسی شئے کو بھی عزیز نہیں کہہ سکتے مثلاً آفتاب اور جب یہ ہر سہ جمع ہو جائیں تو وہ شے عزیز کہلائے گی اور ان ہر سہ معانی میں کمال و نقصان کا اعتبار جاری ہو سکتا ہے چنانچہ کمیاب ہونے میں کمال یہ ہے کہ کوئی شے صرف ایک ہی ہو اور اسی کا مثل محالات سے ہو اس صفت کا موجود بجز ذات باری کے اور کوئی نہیں کیونکہ آفتاب کا مثل محال نہیں بلکہ ممکن ہے کیونکہ وہ مخلوق ہے اور کسی چیز کا نافع ہونے میں کمال یہ ہے کہ وہ تمام منافع کی منبع ہو اور یہ وصف بھی بجز ذات باری کے کسی موجود پر صادق نہیں آتی کیونکہ وہ تمام موجودات کا عدم سے وجود میں لانے والا

ہے اور ہر ایک شے اپنے وجود اور صفات اور بقا میں اس کی محتاج ہے اور عدم وصول میں کمال کسی شے کا یہ ہے کہ کسی چیز کو اس پر قدرت پانے کا موقع نہ مل سکے اور وہ خود تمام اشیاء پر قادر ہو اور اس وصف کا موجود بھی بجز ذات حق سبحانہ و تعالیٰ کے کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہر ایک طرح سے انسانی دائرہ عقول سے بالاتر ہے کہیں سے ثابت ہوا کہ عزیز مطلق بجز ذات باری عزاسمہ کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا امام ممدوح کی یہ تشریح واقعی قابل قدر ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حاصل ہوتا ہے کہ خلقت اس کی طرف حیات اخروی اور سعادت ابدی حاصل کرنے کے لئے محتاج ہوں اور یہ رتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے اور ان کے بعد ان کے قدم بقدم چلنے والے خلفاء راشدین کا اور پھر علماء امت کا بعدہ ان سلاطین کا جو شریعت محمدی کے مطابق سیاست کرتے ہوں۔

فائدہ

اس اسم کی تفسیر میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جس قدر کسی شخص کو دین میں درجہ عالی حاصل ہو گا اسی قدر وہ زیادہ قابل عزت ہو گا اور جس قدر وہ عزت دینی سے بہرہ ور ہو گا اسی قدر اس کا مثل کمیاب ہو گا یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی عزت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کے لئے ہے حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ حقیقی عزت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عزت و عظمت کے سامنے بندہ کے نزدیک ہر ایک عزت و عظمت حقیر ہو جائے اور اس کے ذکر کے سوا تمام افکار دل سے مرتفع ہو جائیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت کا بندہ کو علم ہو جاتا ہے تو تمام مخلوقات نظر سے گر جاتی ہے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے من تواضع لغنی لغناه ذهب ثلثا دينه یعنی جو شخص کسی غنی آدمی کی غنا والداری کی وجہ سے اس کی تعظیم کرتا ہے اس کا دو تہائی

toobaa-elibrary.blogspot.com

دین زائل ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان تین چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے معرفت بالقلب اقرار باللسان عمل بالارکان موجب زبان اور ہاتھ پاؤں سے تعظیم کسی غنی کی کرے گا تو دو تہائی ایمان زائل ہو جاوے گا اور اگر قلب سے بھی معتقد ہو گا تو سب کا سب زائل ہو جاوے گا بعض علماء نے لکھا ہے کہ عزیز وہ ذات ہے کہ جس کو کوئی طالب نہ پا سکے اور نہ کوئی ہارب اس سے بھاگ کر اپنے تئیں چھپا سکے۔

حکایت

کہتے ہیں۔ کہ ایک شخص نے خلیفہ ہارون رشید کو کسی نیکی کے کرنے کی ہدایت کی خلیفہ سخت ناراض ہوا اور حکم دیا کہ اس کو سرکش اور گستاخ گھوڑے کی دم سے باندھ کر مروا دیا جائے ملازمان شاہی نے فی الفور حکم کی تعمیل کی مگر اس شخص کو کوئی ضرر نہ پہنچا خلیفہ نے حکم دیا کہ اس کو ایک مکان میں بند کر کے دروازہ کو چن دیا جائے ملازموں نے ایسا ہی کیا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ایک باغ میں ٹہلتا ہوا نظر آیا جب اسے خلیفہ کے پاس لائے تو اس نے سوال کیا کہ تم کو باغ میں کس نے داخل کیا درویش نے جواب دیا کہ جس نے مجھے ایسے تنگ و تاریک گھر سے باہر نکالا خلیفہ یہ سن کر حیران رہ گیا اور حکم دیا کہ اس شخص کو سور کر کے شہر میں اعلان کر دو کہ ہارون نے اس شخص کو ذلیل کرنا چاہا مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو عزت بخشی اور ہارون ناکام رہا۔

اس موقع پر اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کئی ایک الفاظ خصوص قرآنیہ میں ایسے واقع ہوئے ہیں جو لفظاً مشترک طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں پر بولے گئے ہیں مگر ان کے معانی میں وہی نسبت ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں میں مثلاً قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ اس آیت میں عزت کا لفظ اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم اور اہل ایمان کی نسبت بولا گیا ہے مگر تینوں کی حقیقت ایک نہیں

اللہ تعالیٰ کی عزت بلحاظ اس کے خالق حقیقی ہونے کے ہے اور جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بلحاظ آپ کے نبی اللہ ہونے کے ہے اور چونکہ حضور علیہ السلام افضل الانبیاء ہیں اس لئے آپ کی عزت کا مقام بھی تمام انبیاء علیہم السلام سے بالاتر ہے اور اہل ایمان کی عزت بلحاظ ان کے کمال ایمانی کے ہے اور اس لئے اہل ایمان کو وہ کمالات روحانیہ حاصل ہوتے ہیں جو لوازم ایمان ہیں اور چونکہ انسان کامل مظہر صفات ذات باری ہوتا ہے اس لئے اس کی عزت بطور معلول ہونے کے تمام کمالات ذات باری کا نقشہ ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ذات باری خالق ہے انسان بھی بطور معلول خالق ہو سکتا ہے مثلاً مسیح علیہ السلام کی نسبت فرمایا تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ چونکہ انسان کامل بذاتہ خالق نہیں ہو سکتا اس لئے بانی ارشاد فرمایا تاکہ ایک مخلوق پر خالق حقیقی ہونے کا گمان نہ پیدا ہو اسی طرح ہر ایک فعل کی نسبت بندہ کی طرف ہو سکتی ہے مگر بطور معلول کے نہ بطور علت کے خلاصہ یہ ہے کہ انسان کامل خالق محیی ممیت معز مذل جبار غفار و رحیم نسب کچھ ہو سکتا ہے مگر یہ صفات اس کو بذاتہ حاصل نہیں بلکہ بطور انعام ذات باری کے جبکہ وہ مظہر کامل ہو جاتا ہے بہذا بعض کوتاہ اندیشوں کا یہ اعتراض کہ کسی نبی یا ولی کو یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی کی امداد کر سکے یا کسی قسم کا فیض روحانی پہنچا سکے بالکل ساقط الاعتبار ہے نبی یا ولی یوں کہو۔ کہ انسان کامل محض بطور سبب اسی طرح وسیلہ ہوا کرتے ہیں جس طرح دنیا کے دیگر امور میں اسباب متعارفہ کام دے سکتے ہیں نبی یا ولی جائے خود کچھ نہیں کر سکتے اور انہیں خدائی امور میں کچھ دخل نہیں لیکن ان کا سبب بننا کسی وجہ سے منافی توحید نہیں ہو سکتا اور نہ کسی قسم کی بدعت یا شرک کا موجب ہے تعجب ہے کہ ادویہ کو بطور سبب ازالہ مرض میں وسیلہ مانا جاتا ہے مگر ارواح طیبہ کو خواہ وہ اس زندگی میں ہوں یا عالم برزخ میں اس وصف سے عاری خیال کیا جاتا ہے مسئلہ شفاعت کی حقیقت میں غور کرو تو معلوم ہو گا کہ وہ بجز توسل کے اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا مع ہذا اکابر مشائخ کرام کا بالاتفاق اس امر پر متفق لفظ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہونا منکرین کے خیال کو رد کر رہا ہے اور زیادہ حیرت تو اس امر سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی نص آیت یا حدیث اس مسئلہ کے برخلاف نہیں اور جن آیات کو عبادت غیر اللہ کے منع میں پیش کیا جاتا ہے وہ ہرگز اس مسئلہ کی اصلیت کو باطل نہیں کر سکتیں کیونکہ مسئلہ زیر بحث آیات مذکورہ بالا کے عموم مفہوم میں ہرگز داخل نہیں حضرت عمرؓ بن خطاب کا طلب باراں کے لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے متوسل ہونا کافی دلیل ہے جواز استمداد و توسل پر رہا یہ امر کہ بعد از مرگ بھی ایسا جائز ہے یا نہیں سو مخصم کو اس کے منع پر کوئی دلیل قائم کرنی چاہیے ہم اس مسئلہ کو اور بھی زیادہ دلائل سے مضبوط کرتے مگر یہ مقام اس طوالت کا مقتضی نہیں اور ہمیں یقین ہے کہ منکر جو باب روحانیت سے بالکل ناآشنا ہے ہر ایک حجت کو کسی نہ کسی تاویل باطل سے ٹال دے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ ایسے امور کا اعتقاد زیادہ تر مناسبت فطری پر موقوف ہے جس سے مخصم بے بہرہ ہے مایں ہمہ ہمارا یہ خیال بھی قابل وقعت ہے کہ عوام الناس اس استمداد و توسل کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں اس لئے انہیں رجوع الی اللہ کی جائے نبی یا ولی پر اعتقاد ہو جاتا ہے اور یہ واقعی ہولناک امر ہے بعد انہیں روکنا ضروری ہے امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندوں میں سے عزیز وہ شخص ہے جس کی طرف لوگ سعادت اخروی کے حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں اور ایسے اشخاص قلیل الوجود ہوتے ہیں اور یہ رتبہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان بزرگواران دین کا ہے جو قدم بقدم انبیاء علیہم السلام کے خلف چلے ہوں مثلاً خلفائے راشدین اور علمائے مجتہدین رضی اللہ عنہم اجمعین۔

خاصیت

چالیس روز تک ہر روز اکتالیس بار پڑھیں' غناء ظاہری یا باطنی اور عزت نصیب ہو اور کسی مخلوق کا محتاج نہ ہو۔

اَلْجَبَّارُ

جل جلالہ

اس اسم کے متعلق چند وجوہ قابل ذکر ہیں (ا) جبار ایسی بلند چیز کو کہتے ہیں جس تک رسائی ناممکن ہے عرب بولا کرتے ہیں نخلۃ جبارۃ (کھجور کا وہ درخت جو بہت اونچا ہو) ناقہ جبارۃ او فرس جبار (مضبوط اور قوی ناقہ یا گھوڑا) قال اللہ تعالیٰ اِنَّ فِیْھَا قَوْماً جَبَّارِیْنَ یعنی علماء اس آیت میں جبارین سے وہ لوگ مراد ہیں جو قوم عاد کے ہتھیا تھے اور سخت سرکشی کیا کرتے رجل جبار (ایسے شخص کو بولتے ہیں جو بڑا متکبر اور غیر متواضع ہو اور کسی کی اطاعت نہ کرے)

ذات باری کے حق میں اس اسم کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو عقول و افکار کی رسائی سے بالاتر ہے عقلاء اور علماء اس کی کنہ ذات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(ب) جبار کے معنی مصلح امور کے ہیں عرب بولتے ہیں جبرت الکسیر یعنی میں نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو باندھا جبرت الفقیر یعنی میں نے فقیر کی حاجت کو پورا کیا دعاء میں بولتے ہیں یا جابر کل کسیر مگر لفظ جابر ذات باری کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

لئے باضافت مستعمل ہوتا ہے اور جبار صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی ہیں بڑا اصلاح کنندہ عرب کا مشہور شاعر عجاج کہتا ہے۔

قد جبر الدین الاله فجبر

(جبر لازم و متعدی آتا ہے)

یعنی اصلحه فصلح اس لئے صحیح طور پر اصلاح کنندہ بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی امور کی اصلاح اور انتظام اور مشکل کو آسان کرتا ہے اس توجیہ کی رو سے جبار منجملہ صفات افعال کے ہوگا۔

(ج) عرب بولتے ہیں جبره علی کذا اذا کرهه یعنی جبر کے معنی کسی کو اپنے حسب ارادہ کسی امر پر مجبور کرنے کے ہیں مثلاً جبر السلطان فلاناً علی کذا یعنی بادشاہ نے فلاں شخص کو اپنے ارادہ کے مطابق کسی امر پر مجبور کیا اس لئے ذات باری کے متعلق اس اسم کی توجیہ یہ ہوگی کہ جبار وہ ذات ہے جو اپنے ارادہ پر مخلوقات کو مجبور کرتی ہے خواہ مخلوق اس کو چاہے یا نہ چاہے اور یہی معنی ذات باری کے متعلق صحیح ہو سکتے ہیں کیونکہ سلسلہ کائنات میں بجز اس کے ارادہ کے کوئی چیز موثر نہیں وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے نہ کچھ اور اس معنی کے رو سے بھی جبار منجملہ صفات افعال کے ہے۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ جبروت اور تکبر تو مخلوق کے حق میں صفات مذمومہ میں سے سمجھے گئے ہیں ذات باری کے حق میں کیسے محمود ہو سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جباریت کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے جبروت سے بڑے بڑے سرکشوں کو مقہور کرتا ہے اور اپنی عظمت سے ان کو مغلوب کر کے ذلیل بنا دیتا ہے وہ آمر ہے مامور نہیں وہ قاہر ہے مقہور نہیں اس کی وصف ہے لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ یعنی جو کچھ وہ کرتا ہے اس کی بابت پوچھ نہیں جا سکتا اور مخلوقات کو یہ منصب حاصل نہیں کیونکہ مخلوقات صفات نقص سے موصوف ہے عاجز ہے اور مقہور ایک ناچیز مکھی اور مچھر انہیں تنگ کر سکتے ہیں اور بھوک پیاس کی مصیبت انہیں مغلوب بنا دیتی

ہے اس سے جبروت و تکبر مخلوق عاجز کی شایان شان نہیں حضرت مشائخ لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو وہم اور فہم سے بالاتر ہو بعض یوں لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو فہم سے بالاتر ہو اور زمانہ اس کا خالق نہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ جبار وہ ذات ہے جو اشیاء کی اصلاح بلا کسی چارہ جوئی کے کرے اور دوسروں کو طاعت کا حکم دے اور وہ اس حکم میں کچھ احتیاج نہ رکھتا ہو امام غزالی قدس اللہ روحہ لکھتے ہیں کہ بندوں میں سے جبار وہ شخص ہو سکتا ہے جو اتباع کے دائرہ سے نکل کر اس قابل ہو گیا ہو کہ دوسرے لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں اور اس کی علامت یہ ہے کہ حب مال و جاہ کی قید سے رہائی پا گیا ہو کیونکہ مال و جاہ کا محب در حقیقت اللہ تعالیٰ کا طالب نہیں ہو سکتا مگر جو قوی النفس اور عظیم الہمت ہو کر محبت مال و جاہ سے نکل گیا ہو وہ ماسوی اللہ کی طرف کبھی توجہ تک نہیں کرتا دیکھو اللہ تعالیٰ حضور علیہ السلام کی شان میں ارشاد فرماتا ہے مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی

خاصیت

صبح و شام ۲۱۶ بار پڑھے تو ظالموں کے شر سے محفوظ رہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُتَكَبِّرُ

جل جلالہ

اس اسم کی تفسیر امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے نہایت اعلیٰ طریق پر لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ متکبر وہ ہے جو اپنی ذات کی نسبت دوسروں کو حقیر جانتا ہو اس لئے وہ عظمت و کبریاء کو اپنا حق سمجھتا ہے اور دوسروں کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس سے ملوک و سلاطین اپنے حواشی اور خدام کو دیکھا کرتے ہیں اگر یہی نظر نفس الامر پر مبنی ہو تو وصف تکبر اسی کے لئے صحیح ہے اور وہ ذات اس وصف میں محبوب سمجھی جائے گی مگر اس تفسیر کی رو سے کوئی ذات بجز ذات باری کے اس وصف کی مستحق نہیں اور اگر یہی نظر نفس الامر یا حقیقت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض باطل ہو تو اس ذات کے لئے وصف تکبر صحیح نہیں بلکہ مذموم ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے الکبریاء ردائی والعظمة ازاری من نازعنی واحداً منهما قذفته فی النار یعنی تکبر میری چادر ہے اور بزرگی میرا ازار ہے جو شخص ان ہر دو میں سے کسی کی بابت میرا شریک بننا چاہے گا تو میں اسے جہنم میں جھونک دوں گا اس سے معلوم ہوا کہ تکبر ذات باری کے حق میں تو وصف مدح ہے اور غیر کے حق میں موجب نقص و عیب

مجاہد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تکبر مشتق ہے کبریاء سے جس سے مراد بادشاہت ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ اس آیت میں کبریاء سے بادشاہت مراد ہے اس لئے اور کبریاء اور تکبر اسی ذات کا حق ہے جس کی سلطنت بے زوال ہے اور اس میں وہی جاری ہوتا ہے جو چاہتا ہے سو ایسی ذات وہی مقدس ذات باری ہے جو واحد قہار ہے زجاج نحوی کہتے ہیں کہ ذات باری کی صفت متکبر کے یہ معنی ہیں۔ کہ وہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے سے مبرا ہے کیونکہ یہ صیغہ تکبر عنہ سے ماخوذ ہے۔

واضح ہو کہ یہ توجیہات محض تکلف بارد ہیں صحیح وہی معنی ہیں جو امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے فرما دیئے ہیں۔

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ صیغہ متکبر صرفی وزن کے رو سے باب تفعل کا صیغہ ہے جس کی بناء کسی امر کو تکلف کے ساتھ کرنے پر مبنی ہے یعنی کسی ایسے امر کو کرنا جس کا کرنے والا مستحق نہیں ہوتا اس لئے ذات باری کی نسبت صیغہ متکبر کا استعمال صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہ وصف اس کے لئے ثابت ہے تو تکلف نہ ہو گا اور اگر ثابت نہیں تو اس کی نسبت اس کی طرف درست نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ باب تفعل غیر تکلف کے لئے بھی مستعمل ہے مثلاً تظلم کے معنی اظہار ظلم کے ہیں نہ یہ تکلف ظلم کرنے کے کبھی تظلم کے معنی زیادتی ظلم کے بھی آتے ہیں۔ بعض محققین نے اس کا یہ بھی جواب دیا ہے کہ متکبر کے معنی ہیں الذی یحاول اظهار الکبر ویبالغ فی دالت الاظهار یعنی متکبر وہ ذات ہے جو اپنی بڑائی کا اظہار کامل طور پر کرے پھر اگر یہ وصف اس میں ثابت ہو گی تو اس کے لئے موجب مدح ہے اور گر اظہار میں کاذب ہو تو اس کے لئے باعث مذمت سمجھی جائے گی یہ جواب دقیق متین ہے بعض حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ متکبر وہ ذات ہے جو بڑائی اور بادشاہت میں یگانہ اور بزرگی اور غلبہ میں منفرد ہو اور بعض فرماتے ہیں کہ متکبر وہ ذات ہے جس

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے ہاتھ میں احسان ہو اور غفران کا مالک ہو بعض کہتے ہیں کہ متکبر وہ ذات ہے جس کی سطنت میں زوال اور اس کی عظمت میں تغیر ناممکن ہو۔

انسان کامل کے حق میں متکبر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ماسوی اللہ سے بالکل اپنی التفات کو ہٹائے اور ذات حق کو حق کی نیت پر اپنا معبود بنائے نہ کسی دنیوی یا اخروی غرض کے لئے یہ حظ ہے انسان کامل کا اس اسم سے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے بزرگی اور برکت ہو اور شب زفاف میں بی بی کے پاس جاکر قبل مباشرت دس بار ذکر کرے تو اولاد نرینہ نیک خصلت ہو۔

اَلْخَالِقُ

جل جلالہ

یہ اسم مصدر خلق سے مشتق ہے جس کے معنی لغت میں ایجاد اور ابداع اور عدم سے وجود کی طرف لانے کے ہیں اور نیز بمعنی تقدیر (اندازہ کردن) کے مستعمل ہے دیکھو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے فتبارك الله احسن الخالقين اس آیت میں خلق بمعنی تقدیر ہے کیونکہ دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے یہ امر ثابت ہے کہ خالق (عدم سے وجود لانے والا) بجز ذات باری کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا اگر ہم اس آیت میں خلق بمعنی تقدیر نہ لیں تو تعدد خالق لازم آئے گا اور پھر ایک دوسری آیت میں فرمایا ان مثل عيسى كمثل ادم خلقه من تراب ثم قال له كن فيكون ظاہر ہے کہ اس آیت میں کن فیکون بمعنی ایجاد و ابداع ہے کیونکہ جملہ خلقه من تراب مقدم واقع ہوا ہے اگر اس میں بھی خلق بمعنی ایجاد و ابداع ہو تو تکرار اور حشو لازم آئے گا لیکن اگر بمعنی تقدیر لیں تو معنی صاف ہو جاتے ہیں کیونکہ فعل تقدیر ایجاد و ابداع سے مقدم ہوا کرتا ہے اور اسی معنی کی تائید ہے آیۃ الا له الخلق والامر میں کیونکہ اس میں بھی امر بمعنی کن فیکون ہے اور آیۃ ام تخلق من الطين میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

بھی خلق بمعنی تقدیر و تصویر ہے ورنہ بمعنی ایجاد و ابداع صحیح نہیں اہل عرب اپنے محاورہ میں بولتے ہیں خلق الادیم جب کفش دوز جوتا بناتے وقت چمڑہ کو ایک خاص پیمانہ پر کاٹتا ہے قال الشاعر

ولانت تفری ما خلقت وبعض القوم یخلق ثم لایفری اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ خلق بمعنے تقدیر مستعمل ہے اور تقدیر کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک مقدار معین پر واقع کرنا۔ (شاعر محمد کو کہتا ہے کہ تو جس چیز کا پہلے اندازہ لگاتا ہے پھر اس کو کاٹتا ہے یعنی اس کی تکمیل کرتا ہے اور بعض لوگ اندازہ تو لگاتے ہیں مگر کاٹتے نہیں)

اسی طرح خلق بمعنی ایجاد و ابداع مستعمل ہے چنانچہ آیۃ کما بداء نا اول خلق نعیدہ میں خلق بمعنی ایجاد ہی صحیح ہو سکتا ہے اور نیز آیۃ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ میں بھی خلق بمعنی ایجاد مستعمل ہوا ہے کیونکہ بہ سبیل انکار و رد کرنا اس امر پر صریح دلیل ہے کہ بجز ذات باری کے کوئی موجود خالق نہیں ہو سکتا آیۃ هو اللّٰه الخالق الباری المصور میں غور کرو کہ کس احسن ترتیب کیساتھ اسماء کو منظم کیا ہے اسم جلالت کو مقدم ذکر کیا اور بعد ازاں خالق۔ باری۔ مصور کو یہ ترتیب ذکر کیا ہے کیونکہ خالق بمعنی مقدر کا مفہوم علم کی طرف رجوع کرتا ہے اور باری کا عدم سے وجود میں لانے کی طرف اور مصور کا عوارض جزئیہ لون شکل وضع کی طرف ان اسماء اور ان کی ترتیب میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ ذات باری ہی مادہ اور عوارض کو عدم سے وجود میں لانے والی ہے اس لئے بعض حکماء کا یہ مذہب کہ مادہ قدیم ہے اور ذات باری صرف متصرف ہے بالکل مردود ہو گیا ان ہر سہ اسماء کی جس ترتیب کے سمجھنے کے لئے کیفیت خلق انسان میں غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و فہم اور مخاطب مکلف پیدا کرنا چاہا تو ضروری تھا کہ وہ اپنے علم کامل سے اس کی ترکیب مخصوص اور اعضاء ضروریہ کو مقدر کرتا اور جب یہ مرحلہ پورا ہوا تو اس کو وجود خارجی میں لانے کے لئے

مادہ معینہ کی ضرورت دامن ہوئی جس سے اجسام وجود پذیر ہوئے اور چونکہ ان اجسام کے لئے صورت اور ہیئت مخصوصہ کی ضرورت تھی جس کو مزاج و قوی کی شکل میں ظاہر کیا اس لئے صورت نوعیہ کو اس کے ساتھ مخصوص کر دیا پس وہ ذات اقدس خالق ہے کیونکہ اسی نے اپنے علم کامل سے اشیاء کو مقدار مخصوصہ مناسبہ میں مقدر کیا اور وہ باری ہے کیونکہ اجسام کو عدم سے وجود میں لایا اور وہ مصور ہے کیونکہ اس نے مزاج اور قوی کی ترکیب کو اجسام سے تعلق دیا اسی کیفیت خلق کے ساتھ عالم کائنات کی ایک ایک چیز پر نگاہ کرو تاکہ تم اس ذات اقدس کے لامتناہی اسرار و حکم کا مشاہدہ کر کے اس کے وحدہ لاشریک اور کامل الصفات ہونے کا یقین حاصل کر سکو۔

خاصیت

سات روز تک متواتر روزانہ سو بار پڑھے تو تمام آفات سے سالم رہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْبَارِئُ

عام طور پر اس اسم کے معنی خالق کے کیا کرتے ہیں مگر یہ صحیح نہیں گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ خلق بمعنی ایجاد و ابداع کے مستعمل ہے اگر اس اسم کا مفہوم بھی وہی خالق کا مفہوم ہو تو کلام الٰہی میں حشو لازم آئے گا کما مر اور خود ہر دو اسم کی بناوٹ کا علیحدہ علیحدہ ہونا ہر دو کے مفہوم میں کسی امتیاز کو چاہتا ہے علمائے عربیت نے اس اشکال کے رفع کرنے میں مختلف اقوال پیش کئے ہیں چنانچہ ان میں سے تین مشہور قول حسب ذیل ہیں۔

(ا) باری بمعنی موجد و مبدع یقال برأ اللہ الخلق (اللہ تعالیٰ نے خلقت کو پیدا کیا) چنانچہ بریۃ خلقت یا موجودات کو بولتے ہیں فعیلہ بمعنی مفعولہ ہے اور اس کی اصل مہموز اللام ہے مگر استعمال میں ہمزہ کو حذف کر دیا کرتے ہے ابو عبیدہ ہروی کہتے ہیں کہ اہل عرب پانچ الفاظ میں ہمزہ کو حذف کر کے استعمال میں لاتے ہیں اور وہ الفاظ یہ ہیں بریۃ ریۃ خابیۃ سیۃ ذریۃ اس تحقیق کے مطابق خالق اور باری میں کچھ فرق نہیں۔

(ب) باری مشتق ہے بروبا بری سے اہل زبان بولتے ہیں بریت السہم وبریت السہم میں نے تیر کو تراشا یا قطع کیا یا درست کیا اس صورت میں باری کے معنی ہوں گے ایسی ذات جس نے بعض شیاء کو بعض سے جدا کیا بعض اہل عربیت نے اس کو برامن المرض سے مشتق کیا ہے اور نیز اہل عرب بولتے ہیں برء الرجل من امراتہ جب کہ وہ اپنی عورت سے قطع تعلق کرے اس صورت میں بھی مذکورہ بالا توجیہ صحیح ہو سکتی ہے۔

(ج) باری مشتق ہے بری بروزن رحی سے جس کے معنی خاک کے ہیں ابن درید کا یہی مذہب ہے اہل عرب بولتے ہیں۔ بفیہ التراب یعنی خاکش مدہن اس تعبیر کے مطابق خالق کے معنی ہوں گے وہ ذات جس نے انسان کو عدم سے وجود عطا اور باری وہ ذات جس نے اس کو خاک سے مرکب کیا قال اللہ تعالیٰ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ اہل لغت لکھتے ہیں کہ لفظ باری کا استعمال دیگر اشیاء کی نسبت حیوان کے پیدا کرنے کے ساتھ زیادہ خصوصیت رکھتا ہے چنانچہ براء اللہ الانسان تو صحیح ہے مگر براء اللہ السماء والارض صحیح نہیں یہی وجہ ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ قسم کے موقعہ پر کثرت یوں فرمایا کرتے والذی خلق الحبۃ وبراء النسمۃ یعنی اس ذات کی قسم ہے جس نے دانہ کو پھاڑا اور جان کو پیدا کیا اس سے ابن درید کے مذہب کی تائید ہوتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں فھو باعتبار تقدیر ھذہ الامور و باعتبار الایجاد علی وفق التقدیر خالق وباعتبار مجرد الایجاد و الاخراج من العدم الی الوجود باری والا یجاد المجرد شیئی والا یجاد علی وفق التقدیر شیئی اخر یعنی خالق کا مفہوم ایک ایسی ذات ہے جو کسی شئے کے تقدیر معین کے مطابق وجود میں لائے اور باری صرف عدم سے وجود میں لانے والی ذات کو بولتے ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

خاصیت

کثرت ذکر کرنے سے ضائع عجیبہ کا ایجاد آسان ہو اور اگر بانجھ عورت سات روز تک روزہ رکھے اور پانی سے افطار کرے اور بعد افطار کے ۲۱ بار پڑھے ان شاء اللہ حمل قرار پاوے اور اولاد ہو۔

اَلْمُصَوِّرُ

جل جلالہ

اسم مصور کے متعلق صرف یہی کافی ہے کہ یہ لفظ صورت سے مشتق ہے جس کی توجیہ میں دو قول ہیں اول یہ کہ صار یصور سے مشتق ہے جس کے معنی امالہ (جھکانے) کے ہیں دوم یہ کہ صار یصیر سے مشتق ہے کچھ ہوا وہ اور صورت دو مفہوم علیحدہ علیحدہ ہیں کیونکہ مادہ سے جسم کا وہ جزء مراد ہے جس سے وہ جسم ممکن الحصول ہوتا ہے اور صورت سے وہ جزء جس سے وہ جسم بالفعل موجود ہو جاتا ہے یعنی صورت کسی شئے کے تر خیر کا نام ہے جس سے وہ وجود پذیر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر سہ اسماء کی ترتیب میں اس کو اخیر رکھا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے اجسام کو مختلف صورتیں دی ہیں یہ تمام صورتیں صور نوعیہ کہلاتی ہیں انسان کی صورت نوعی تمام اشیاء کی صور نوعیہ سے اشرف واقوم ہے قال اللہ تعالیٰ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ خالق وہ ذات ہے جس نے اشیاء عالم کو بلا مثیر پیدا کیا اور بعض نے لکھا ہے کہ خالق وہ ذات ہے جس نے موجودات کو اپنی قدرت کاملہ سے وجود عطا اور اپنے ارادہ سے ہر ایک چیز کا اندازہ مقرر کیا بعض لکھتے ہیں کہ خالق وہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

ذات ہے جس نے مخلوقات کو بلا سبب و علت پیدا کیا اور ان کو بغیر جلب منفعت اور دفع مضرت کے وجود عطا فرمایا اسم باری کے متعلق حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ وہی ذات اقدس باری ہے تو اس کے قلب پر حوادث کا اثر نہیں ہوتا بعض لکھتے ہیں کہ اس یقین کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عارف کے اپنی قوت و سطوت سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور اپنی عبودیت اور طاعت کو نظر سے ساقط کر دیتا ہے اور اظہار احسان نہیں کرتا اسی طرح اسم مصور کی نسبت یوں فرماتے ہیں کہ مصور وہ ذات ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں کیا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظواہر کو صورت حسنہ سے مزین فرمایا ہے اسی طرح بواطن کو سیرت حسنہ سے زینت بخشی ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ

انسان کامل کو ان اسماء سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ معرفت حقائق سے قوت نظری کی تکمیل کرتا ہے اور محاسن اخلاق سے قوت عملی کو مکمل بناتا ہے جب انسان ان ہر دو قوت کی تکمیل کر لیتا ہے تب وہ اپنی تلقین سے لوگوں کے عقول میں حق کی تصویر قائم کر دیتا ہے اور یہی اسم مصور کا مقصد ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے صنائع عجیبہ کا ایجاد آسان ہو اور اگر بانجھ عورت سات روز تک روزہ رکھے اور پانی سے افطار کرے اور بعد افطار کے ۲۱ بار پڑھے ان شاء اللہ حمل قرار پاوے اور اولاد ہو۔

اَلْغَفَّارُ

جل جلالہ

مغفرت مصدر ہے ذات باری کے متعلق قرآن مجید میں تین اسم مستعمل ہوئے ہیں غافر غفور غفار بعض محققین نے لکھا ہے کہ بندہ کے لئے بھی معصیت کے قوت و ضعف کے لحاظ سے تین مدارج ہیں ظالم اس صورت میں ذات باری اس کے لئے غافر ہے ظلوم اس جہت سے ذات باری اس کے لئے غفور ہے ظلام اس صورت میں اس کی مغفرت کے لئے ذات باری غفار ہے اور چونکہ بندہ کے صفات متناہی ہیں اور ذات باری کے صفات غیر متناہی اس لئے ضروری ہے کہ غیر متناہی متناہی پر غالب آئے اس بنا پر رحمت کو عذاب پر راجح ظاہر کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ مغفرت کے متعلق بہت سے آیات قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں بعض تو بلفظ ماضی ہیں اور بعض بصیغہ مستقبل اور بعض بصیغہ امر اور بعض بصیغہ مصدر اور ان سب کا مآل ایک ہی ہے۔

یہ لفظ لغت میں بمعنی ستر (پوشیدن) کے مستعمل ہے اسی سے مغفر (خود آہنی) مشتق ہے اسی خیال پر جمہور کا مذہب ہے کہ مغفرت الٰہی سے مراد

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے معاصی کو مستور کر کے انہیں ان معاصی پر مطلع نہ کرنا۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ مغفرت کی یہ تفسیر صحیح نہیں کیونکہ آدم اور موسےٰ اور داؤد انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور ان پر مغفرت کے نازل ہونے کا بھی بیان فرما دیا ہے پھر معصیت کا مستور رکھنا کیسے ہو؟ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ مغفرت سے عفو و صفح بر سبیل مجاز مراد ہے خاکسار کا خیال ہے کہ جمہور کی رائے کی توجیہ یوں ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کے گناہوں کو مستور فرما دے گا دنیا میں اگر بغرض عبرت اس کا ذکر کر دیا گیا ہے تو یہ امر جائے خود ایک مصلحت عامہ پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی معصیت کو دنیا میں کبھی تو مستور کر دیتا ہے جیسے دعاء مشہور میں وارد ہوا ہے یا من اظہر الجمیل و ستر القبیح اور کبھی بغرض مصلحت ظاہر فرما دیتا ہے مگر عام حالات قبیحہ میں جو انسان کے قلب اور بدن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ستر و اخفا فرماتا ہے مثلاً دل کے وساوس اور برے خیالات جن پر بجز عالم الغیب کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا اور بدن کے وہ حصص جن کا ظاہر ہونا موجب قباحت ہے ہمیشہ مستور رہتے ہیں مغفرت آخرت کے متعلق تو صرف ستر و خفا ہی ہو گا بلکہ خود مغفور لہ سے بھی اس کے معاصی کو مستور کیا جائے گا تاکہ وہ نادم نہ ہو۔

آیۃ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا میں ہر سہ الفاظ عفو مغفرت اور رحمت کی ترتیب میں غور و فکر کرو کہ کس خوبی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں عفو سے مراد ہے گناہوں کا محو کر دینا اور مغفرت سے اشارہ ہے اغیار اور خود اہل معصیت سے گناہوں کے مخفی رکھنے کی طرف کیونکہ جس طرح اطلاع غیر گنہگار کے لئے موجب ندامت ہے اسی طرح گناہ کی یاد بھی اس کے حق میں باعث خجالت ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ لطف و احسان یعنی نعمائے جنت کی بھی استدعا کا حکم دیا ہے اور یہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ایسی استدعا کا حکم بندہ کو نہیں دیتا

جس کے پورا کرنے پر وہ راضی نہ ہو کیونکہ مغفرت میں بعض لطائف کا ذکر اکابر کی کلام میں آچکا ہے ہم انہیں ذیل میں بطور اختصار قلمبند کرتے ہیں چنانچہ آیۃ غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب ذی الطول کی تشریح میں مختلف اقوال وارد ہوئے ہیں اور بعض نے لکھا ہے کہ وہ غافر الذنب ہی بطور اکرام کے اور قابل التوب ہے بطور انعام کے شدید العقاب ہے بطور عدل کے ذی الطول ہے بطور احسان کے اور بعض لکھتے ہیں کہ ان الفاظ کی تفسیر یوں ہے غافر ذنب المذنبین یعنی گنہگاروں کے گناہ بخشنے والا قابل التوب ای توبۃ التائبین یعنی رجوع کرنے والوں کی توبہ کو قبول فرمانے والا شدید العقاب للکافرین یعنی کفار کو سخت عذاب کرنے والا ذی الطول علی المومنین یعنی اہل ایمان کے حق میں احسان و انعام کرنے والا اور بعض نے ان الفاظ کی یوں تفسیر کی ہے کہ وہ غافر الذنب ہے ظالمین کے لئے اور قابل التوب ہے مقتصدین (معتدلین) کے لئے اور شدید العقاب ہے کافرین کے لئے اور ذی الطول ہے سابقین کے لئے ابوبکر واسطی فرماتے ہیں کہ وہ غافر الذنب ہے اس شخص کے لئے جو لا الہ الا اللہ کہے اور قابل التوب ہے اس شخص کے لئے جو لا الہ الا اللہ کی معرفت پر ثابت قدم رہے اور شدید العقاب ہے اس شخص کے حق میں جو حقیقت لا الہ الا اللہ کا منکر ہو اور ذی الطول ہے اس سعادت مند کے حق میں جو لا الہ الا اللہ کے معارف و اسرار کا مشاہدہ کرے۔

اس آیت شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے چار صفات کا ذکر فرمایا ہے جن میں سے تین یعنی مغفرت قبول توبہ۔ ذوالطول تو اہل ایمان کے لئے ہیں اور ایک یعنی شدید العقاب کفار کے لئے اور اس میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ اس کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے چنانچہ فرمایا سبقت رحمتی غضبی اور نیز اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اہل ایمان کے تین مدارج ہیں۔ ظالم لنفسہ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات اور ان ہر سہ اہل ایمان کے لئے علیحدہ علیحدہ ہر صفات مذکورہ بالا ثابت ہیں۔ مگر کفر کے مختلف اقسام ایک ہی حقیقت انکار پر

toobaa-elibrary.blogspot.com

مشتمل ہوتے ہیں۔ پس ہر ایک قسم کے کافر کے لئے ایک ہی صفت شدید العقاب کافی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل جنت کے لئے تین قسم کے پینے کی چیزوں کا ذکر کیا حیث قال اللّٰہ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِہَا عِبَادُ اللّٰہِ (۲) یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ خِتٰمُہٗ مِسْکٌ وَسَقٰھُمْ رَبُّھُمْ شَرَابًا طَھُوْرًا اور کفار کے حق میں فرمایا وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا۔

اس نکتہ کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہر چہار صفت کے بیان میں صفت شدید العقاب کو صفت مغفرت قبول توبہ کے بعد ذکر فرمایا ہے اشارہ یہ ہے کہ توبہ ہر ایک فرد بشر کے لئے ضروری ہے کیونکہ مشرک کو شرک سے اور کافر کو کفر سے اور مومن فاسق کو فسق سے توبہ کی ضرورت ہے اور مومن جو جرم غفلت یا صغائر کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں غفلت اور صغائر سے توبہ کرنا ضروری ہے اور بصورت توبہ نہ کرنے کے بندہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستوجب ہو جاتا ہے اسی طرح صفت غافر الذنب کو قابل التوب پر مقدم کیا اشارہ یہ ہے کہ مغفرت الٰہی بندہ کے حق میں توبہ سے پہلے ہی مقدر ہو چکی ہے اور ان ہر دو صفت کو واؤ عاطفہ سے بیان فرمایا فقال غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ اشارہ یہ ہے کہ مغفرت توبہ کے ساتھ مشروط نہیں کیونکہ واؤ عاطفہ معطوف اور معطوف الیہ کی مغایرت کا پتہ دیتی ہے صاحب کشاف اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص کو شراب پینے کی عادت تھی آپ نے یہی آیت لکھ کر اپنے قاصد کے ہاتھ اس کی طرف ارسال کی اور لوگوں سے کہا کہ اس کے حق میں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ نصیب کرے اور قاصد کو ہدایت کی کہ جب وہ شخص ہوش کی حالت میں ہو تو اسے یہ رقعہ دینا چنانچہ قاصد اس کے پاس پہنچا اور اس نے رقعہ حوالہ کیا وہ شخص پڑھتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اس فرمان واجب الاذعان کا اس کے دل پر ایسا اثر پڑا کہ اسی وقت میخواری سے توبہ کر لی۔

اس آیت کے ذیل میں مناسب نظر آتا ہے کہ آیۃ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا کی تفسیر بھی لکھی جائے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ مروی ہے کہ جب وحشی نے حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ احد میں قتل کر ڈالا تو بھاگ کر طائف میں چلا گیا وہاں پہنچ کر اپنے کئے پر سخت پشیمان ہوا اور جناب نبوی میں بدین مضمون ایک عریضہ ارسال کیا کہ آیا میرے لئے توبہ کی گنجائش باقی ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ان اللّٰہ لایغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذلک لمن یشاء یعنی اللہ تعالیٰ شرک نہیں بخشے گا اور اس کے سوا باقی جس قدر گناہ ہیں جسے چاہے بخش دے گا وحشی نے دوبارہ عرض کی کہ شاید میرے لئے مشیت الٰہی مغفرت کی مقتضی نہ ہو اور لمن یشاء کا مصداق نہ ہوں تب یہ آیت نازل ہوئی والذین لایدعون مع اللّٰہ الٰھاً الاٰخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل ذلک یلق اثاما یضٰعف لہ العذاب یوم القیٰمۃ ویخلد فیہ مھانا الا من تاب وآمن و عمل عملاً صالحاً یعنی جو شخص توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور اعمال صالح بجا لائے عذاب دوزخ سے محفوظ رہے گا اس پر وحشی نے پھر عرض کی کہ ممکن ہے کہ میرے پاس اعمال صالح بھی نہ ہوں اس پر یہ آیت نازل ہوئی قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم ان اللّٰہ یغفر الذنوب جمیعاً اس آیت میں چند امور قابل غور ہیں اول لفظ اسرفوا کے مفہوم میں ہر ایک قسم کا صغیرہ کبیرہ گناہ داخل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغفرت کو کسی خاص گناہ مثلاً زنا شراب خوری کذب غیبت وغیرہ سے مخصوص نہیں کیا مع ھذا مختلف قسم کے گناہ چونکہ خارج از شمار ہیں اس سے کلام میں بے سود طوالت پیدا ہو جاتی نیز اس سے سامعین کی پردہ دری لازم آتی لہذا اس ذات ارحم الرحمین نے ایک ایسا جامع لفظ رکھ دیا جس سے بڑھ کر اور اس مقام میں موزوں نہیں تھا سو جب وہ ذات اس دنیا میں اپنے بندوں کی پردہ دری جائز نہیں رکھتی تو قیامت کے دن کیسے جائز رکھے گی۔

دوم قاعدہ ہے کہ غلام کا تاوان مولےٰ کیا کرتا ہے پھر مولیٰ یا تو غلام کو بیچ کر تاوان وصول کر لے یا خود متحمل ہو یہاں بیچ ڈالنے کی تو کوئی

toobaa-elibrary.blogspot.com

صورت نہیں لہذا مولیٰ ہی اپنے ذمہ لے گا یعنی اپنے بندہ کو محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے گا۔

سوم لفظ یا عبادی میں عباد کو اپنی ذات کی طرف اضافت کیا ہے جس سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ ذات ارحم الرحمین باوجود بندوں کے مجرم ہونے کے انہیں اپنی طرف نسبت کرنے سے عار نہیں کرتی گو بندے گناہ سے باز نہ آئیں مگر پھر بھی وہ اس کے عاجز بندے ہیں۔

چہارم لفظ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ بندوں کا اسراف یعنی ارتکاب جرم در حقیقت انہیں کے حق میں مضر ہے نہ ذات باری کے حق میں سو ان کے لئے یہی ضرر کافی ہے اس لئے دوسری مصیبت یعنی عذاب ان پر عائد نہیں کیا گیا۔

پنجم صیغہ لا تقنطوا سے صریح طور پر نہی فرمائی اور نہ صرف نہی فرمائی بلکہ اس نہی کی مخالفت کرنے والے کے حق میں وعید بھی کی حیث قال اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کفار ہی ناامید ہو سکتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ امید رحمت کو منقطع کر دینا بھی منجملہ عدمات کر کے شمار کیا گیا ہے۔

ششم اس آیت میں لفظ جمیعاً سے جز شرک کے ہر ایک قسم کے گناہ کی مغفرت کا وعدہ ہے اور یہی صحیح مذہب بھی ہے بعض مفسرین نے اس مغفرت کو توبہ سے مشروط قرار دیا ہے مگر حق یہ ہے کہ مغفرت مومن کے لئے ہرگز مشروط بہ توبہ نہیں چنانچہ آثار محکمہ میں اس کی پوری پوری تائید موجود ہے۔

ہفتم آیت کے اخیر پر فرمایا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ یہ جملہ گذشتہ مضمون کے لئے بمنزلہ دلیل کے ہے جس کی صورت یوں ہے کہ مغفرت و رحمت کچھ تمہارے لئے مشروع نہیں ہوئی بلکہ یہ تو اس ذات مقدس کا قانون ہے اور جملہ اسمیہ اور حرف تحقیق اور ضمیر مرفوع منفصل کا لانا اس مضمون کو اور بھی موکد کرتا ہے۔

اس آیت کے ذیل میں آیۂ نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ بھی قابل غور ہے اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ چند صحابہ آپس میں بیٹھے ہنس رہے تھے حضور علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا تم لوگ ہنس رہے حالیکہ تمہارے سامنے آتش دوزخ ایک مرحلہ آنے والا ہے۔ یہ لوگ اس بات کو سن کر سخت محزون اور ملول ہوئے تھوڑی دیر گذری تھی کہ حضور علیہ السلام پھر تشریف لائے اور فرمایا کہ جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے ہیں اور بارگاہ رب العزت سے مذکورہ بالا آیات لائے جس کا مطلب یہ ہے کہ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ بیشک میں بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اس آیت میں چند نکات قابل بیان ہیں۔

(۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ قرآن مجید کے حروف کی تعداد تین لاکھ پچیس ہزار اکہتر ہے اگر امت محمدیہ کے لئے قرآن مجید میں سوا حرف یا کے جو عبادی کا مضاف الیہ ہے اور کوئی بشارت نہ ہوتی تو ان کے لئے کافی تھی کیونکہ جس طرح لفظ عبادی کے حرف دال اور حرف یا میں کچھ فاصلہ نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کے گنہگار بندوں کے درمیان کوئی حجاب نہیں۔

(۲) لفظ نبی سے جناب نبوی کو خطاب کیا گیا ہے اور یاء متکلم سے خود ذات باری عزاسمہ مراد ہے اور ہر دو کے درمیان لفظ عباد واقع ہو ہے جس سے عاصیان امت محمدیہ مراد ہیں اشارہ یہ ہے کہ گنہگار ان امت کے آگے آگے تیری شفاعت ہے اور ہماری رحمت ان کے پیچھے پیچھے اور وہ ہر دو کے درمیان ہیں سو کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی قسم کا صدمہ یا ضرر پہنچے۔

(۳) بندگان گنہگار کا اپنے مولیٰ کی طرف منسوب ہونا ان کے لئے موجب فخر و مباہات ہے اور یہی نسبت ان کے لئے کافی ہے کہ وہ اس کے بندے ہیں خلیفہ مامون کی نسبت مروی ہے کہ ایک دفعہ اس کا پوتا اور دادا اس کے پاس موجود تھے خلیفہ نے ان سے پوچھا کہ تم اپنا اپنا نسب بیان کرو پوتے نے اپنا نسب

toobaa-elibrary.blogspot.com

بیان کیا اور دوہتے نے اپنا خلیفہ نے پوتے کا منہ جواہرات سے پر کیا اور دوہتے کے منہ میں شکر بھر دی اور فرمایا کہ پوتا ہماری طرف منسوب ہے اور دوہتا اغیار کی طرف سو جب سلاطین دنیا کی طرف منسوب ہونا موجب امتیاز ہے تو اس سلطان السلاطین کی طرف منسوب ہونا کیوں موجب عزت و افتخار نہ ہو گا اور یہی نسبت استحقاق رحمت کے لئے علت ہے۔

(۴) اس آیت میں یہ نکتہ نہایت قابل غور ہے کہ جملہ اِنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ میں تکریر ضمیر متکلم نے جملہ کو کس طرح موکد بنا دیا ہے اس کی مثال خود قرآن مجید میں موجود ہے انی انا رب میں اس تکریر ضمیر سے موسیٰ علیہ السلام کے خوف اور وحشت کو دور کیا اور انی انا اخوک میں یوسف علیہ السلام کے بھائی کی وحشت کو انس کے ساتھ بدل دیا جس کی تقریر یوں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو دستر خوان پر بٹھایا تو سب بھائی دو دو ہو کر بیٹھ گئے اور بنیامین (جو یوسف علیہ السلام کے حقیقی بھائی تھے) اکیلے رہ گئے اور انہیں یوسف کی یاد سے دل پر سخت چوٹ لگی اور رونا شروع کیا یوسف علیہ السلام نے پوچھا کہ تم کیوں روتے ہو بنیامین نے کہا کہ میرا بھی ماں جایا حقیقی بھائی تھا اگر آج ہوتا تو وہ بھی میرے ساتھ بیٹھتا۔ یوسف علیہ السلام نے اس کی اس حالت زار کو دیکھ کر کہا اِنِّیْ اَنَا اَخُوْکَ یعنی تم غم مت کرو میں تمہارا بھائی ہوں اس جملہ سے بنیامین کے دل کو تسلی اور اطمینان حاصل ہوا اور اس کی وحشت انس سے مبدل ہو گئی یہی صورت اس آیت میں متحقق ہے جب بندہ گنہگار اپنے گناہوں کو دیکھ کر حسرت و یاس میں مبتلا ہوتا ہے اس ارحم الراحمین کا وعدہ اِنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ اس کی وحشت کو انس سے بدل دیتا ہے اور اس کو پورا پورا اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

اس امر کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسماء غافر غفور غفار میں بحاظ معنی کے بہت تفاوت ہے یعنی غفور بہ نسبت غافر کی اور غفار بہ نسبت غفور کی بدرجہ کمال مغفرت کے مفہوم پر مشتمل ہے بعض حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ وہ ذات

مقدس غافر ہے کیونکہ نامہ اعمال سے معصیت کو دور کر دیتا ہے اور وہ غفور ہے کیونکہ ملائکہ جو کاتبان اعمال سے بندہ کے گناہ فراموش کرا دیتا ہے اور وہ غفار ہے کیونکہ بندہ کو بھی اس کے معاصی مطلقاً فراموش کرا کے بیہاں بنا دیتا ہے کہ اس کو اپنے گناہوں کا علم ہی نہیں رہتا کیونکہ باوجود مغفرت کے اگر گناہ کی یاد باقی رہے تو یہ بات بھی ناخوش معلوم ہوتی ہے اور طبیعت میں ندامت پیدا ہو کر مسرت کو مکدر بنا دیتی ہے بعض نے لکھا ہے کہ وہ ذات قدس غافر فی الدنیا اور غفور فی القبر اور غفار فی یوم الحساب ہے بعض نے فرمایا ہے کہ جس کا ایمان علم الیقین کے درجہ پر ہو اس کے حق میں غافر ہے اور جس کا ایمان عین الیقین کے رتبہ پر ہو اس کے حق میں غفور ہے اور جس کا ایمان حق الیقین کے مقام پر ہو اس کے لئے غفار ہے۔

انسان کامل کا ہیرہ اس اسم سے یہ ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب اور مقابح پر اسی طرح پردہ پوشی کرتا ہے قال علیہ الصلوٰۃ والسلام من ستر علی مومن عورتہ ستر اللہ علیہ عورتہ یوم القیامۃ جو شخص کسی مومن کے عیب پر پردہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیب پر پردہ ڈال دے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ کوئی شخص کمال و نقصان اور صواب و خطا سے خالی نہیں سو جو شخص کسی کی برائیوں سے اغماض کر کے اس کی خوبیوں کا ذکر کرے وہ اس اسم سے کامل بہرہ رکھتا ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک مرے ہوئے کتے کی لاش پر گذرے ساتھیوں نے کہا کہ کیسی ناگوار بو آ رہی ہے آپ نے فرمایا کہ اس کتے کے دانتوں کی سفیدی کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے گویا آپ نے ان لوگوں کو نہایت عمدہ طریق سے یہ تعلیم فرمائی کہ کسی کے عیب کو نظر انداز کر کے اس کی خوبی کو دیکھنا چاہیے۔

خاصیت

بعد نماز جمعہ سو بار پڑھے تو آثار مغفرت پیدا ہوں یعنی ہر تنگی دفع ہو بے گمان رزق ملے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْقَهَّارُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ اور نیز فرمایا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ یہ اسم مصدر قہر سے مشتق ہے جس کے معنی غلبہ کے ہیں اور نیز کسی چیز کو اس کے اقتضاء طبع سے بہ سبیل جبر روکنے کے ہیں اور قہار مبالغہ کا صیغہ ہے جس سے کثرت قہر کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے علماء نے اس کی توجیہ میں مختلف اقوال بیان کئے ہیں بعض کہتے ہیں کہ قہر ایک خاص وصف پر قدرت رکھنے کا نام ہے جس طرح رحمت ایک وصف مخصوص کے ارادہ کو کہتے ہیں قاہر اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کو کسی امر سے روک کر اس کے برخلاف پہلو پر چلا سکے اس توجیہ کے رو سے یہ اسم منجملہ صفات ذات کے سمجھا جائے گا اور بعض لکھتے ہیں کہ قہار اس ذات کو کہتے ہیں جو غیر کو اس کے ارادہ کے مطابق جاری ہونے سے روک سکے اس صورت میں یہ اسم منجملہ صفات فعل کے ہوگا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ قہر ذات باری کی مختلف صورتیں ہیں۔

اول یہ کہ تمام موجودات ممکن حادث ہیں اگر اللہ تعالیٰ کے دائرہ قہر

سے باہر ہو جائے تو کوئی چیز دائرہ وجود میں قائم نہ رہ سکے جس کا مطلب یہ ہے کہ عدم اور وجود ہر دو تابع قہر الٰہی ہیں جس سے ممکنات کے عدم کو وجود سے بدل دیا ہے اور اس کی حکمت کاملہ کے مطابق بوجہ اس کے قاہر ہونے کے عدم ان پر طاری نہیں ہوتا کیونکہ اس کے قہر نے اس کو روک رکھا ہے۔

دوم یہ کہ بموجب تحقیق اہل ہیئت ثابت ہو چکا ہے کہ شمس و قمر اور اکثر سیارے کرہ ارض سے کئی گنا بڑی جسامت رکھتے ہیں اور افلاک کی جسامت کا تو اندازہ کون کر سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور صفت قہر نے ان سب کو بلا کسی سہارے کے اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہوا ہے اور وہ ہرگز اپنے مرکزوں سے ادھر ادھر نہیں ہوتے۔ قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو بلا کسی سہارے کے ان کی جگہ پر قائم رکھا ہے کیا مجال ہے کہ وہ اپنے مرکزوں سے ادھر ادھر ہو جائیں۔

سوم یہ کہ تمام مادی جسم عناصر اربعہ کی ترکیب سے بنتے ہیں اور عناصر اربعہ اپنی اپنی طبعی خاصیت کی وجہ سے امتزاج اور ترکیب کے مقتضی نہیں مگر اس کی قدرت کاملہ نے ان کو ایسا امتزاج بخشا ہے کہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے سب اس کی صفت قہر کا نتیجہ ہے۔

چہارم یہ کہ روح ایک لطیفہ نورانیہ ہے جو مادہ اور لوازم مادہ سے بالکل بری ہے مگر غور کرو کہ اس کی قدرت کاملہ نے کس طرح اس ہیکل عنصری کے ساتھ اس کو تعلق بخشا ہے جو بالکل ظلمانی اور کثیف ہے مگر اس کی صفت قہر ان ہر دو کے تعلق کو زائل نہیں ہونے دیتی۔

پنجم یہ کہ دنیا میں کس قدر عظیم الشان اور جبار و متکبر سلاطین و ملوک گذرے ہیں مگر اس کی صفت قہر انہیں امراض موت وغیرہ حوادث سے کس طرح مغلوب اور عاجز بنا دیتی ہے اور وہ باوجود یکہ ہزاروں تدابیر اور کوششیں ان حوادث کو روکنے کے لئے عمل میں لاتے ہیں مگر کچھ پیش نہیں چلتی یہیں سے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اس کی قہاریت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔

ششم عقول بشری تحقیق اشیاء میں کس قدر باریک بین ہیں مگر اس ذات قدس کی حقیقت کے ادراک میں عاجز محض ہیں اور اس کے انوار جلال و جبروت کے احاطہ کرنے سے نگاہیں خیرہ ہیں اور یہی اس کی صفت قہر کا ثبوت ہے۔

ہفتم ہم چشم بصیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ تمام ذات کائنات اس ذات اقدس کی مشیت کے تابع ہیں اور خود انسان ہزارہا امور میں اپنے ارادہ کے برخلاف ناکام رہتا ہے الغرض کوئی چیز اس ذات بیچون کے ارادہ سے باہر نہیں جا سکتی نہ وجوداً نہ عدماً قال اللہ تعالیٰ وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ پھر فرمایا وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ وہ ذات اقدس قاہر ہے اس لئے کہ نفوس عابدین پر غالب آکر ان کو اپنی طاعت پر مجبور رکھتی ہے اور وہ قہار ہے اس لئے کہ قلوب طالبین پر غالب آکر ان کو اپنا انیس بناتی ہے اور لطف مشاہدہ جمال سے عزت بخشتی ہے۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ قہار وہ ذات ہے جو اپنے بندوں سے بشریت کے آثار اور رسوم کے مٹا دینے اور علم و عزت کے کھو دینے کی طالب ہو بعض نے اس کی یوں توجیہ کی ہے کہ قہار وہ ذات ہے جس کی صولت و حشمت کے سامنے کسی کی صولت و حشمت کا ظہور نہ ہو بلکہ اس کے سامنے محو ہو جائیں اور جس کی سطوت کے سامنے تمام مخلوق عاجز ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ یعنی قیامت کے دن جبکہ اللہ تعالیٰ اپنے وصف قہاریت کا اظہار فرماوے گا تو اہل محشر کو جہاں گرد باگرد خلائق جمع ہو گی یہ آواز سنائی جائے گی کہ آج کے دن سلطنت کا مالک کون ہے؟ چونکہ تمام مخلوق اپنے اپنے حال بد میں مبتلا ہو گی اس لئے کسی کو وہاں دم مارنے کی مجال نہیں ہو گی تب خود ہی دوسری آواز سنائیں گے کہ آج بڑے بڑے مدعیان کے تمام دعاوی خاک میں مل گئے اور وہی حقیقی مالک الملک آج کے دن کی سلطنت کا مالک

ہے جو اپنے کمال صفات میں یگانہ اور سب اشیاء پر غالب آنے والا ہے بتلاؤ آج بڑے بڑے جبارین کہاں ہیں سلاطین نامدار اور ملوک کامگار کو کیا ہوا؟ اور انبیاء و مرسلین کس حال میں ہیں؟ اور کفار و مشرکین اور فساق ملحدین کیوں اپنے تئیں ظاہر نہیں کرتے؟ ایک بے نیازی کا عالم ہو گا جہاں انبیاء و مرسلین اور ملائکہ مقربین اور ارواح و اجسام سب کے سب بے حقیقت ہو جائیں گے اور ایک ذات اقدس جو تمام کمالات کی جامع ہے اپنی بے نیازی کے ساتھ تمام موجودات محشر پر جلوہ افروز ہو گی اور بس۔

عبد کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تمام اعداء پر غالب آتا ہے چونکہ سب سے بڑھ کر دشمن انسان کا اپنا نفس ہے اس لئے جو شخص شہوت و غضب اور حرص و وہم و خیال پر غلبہ پا لیتا ہے وہ درحقیقت تمام اعداء کو مغلوب کر لیتا ہے اور کسی غیر کو اس پر غلبہ پانے کا موقع نہیں مل سکتا رہا یہ امر کہ غضب و شہوت وغیرہ پر انسان کیونکر غالب آسکتا ہے؟

سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر کبھی تو بذریعہ مجاہدات و ریاضت کے حاصل ہوتا ہے کما قال اللہ تعالیٰ وَالَّذِیْنَ جَاہَدُوْا فِیْنَا لَنَہْدِیَنَّہُمْ سُبُلَنَا اور کبھی بذریعہ جذبات حق کے چنانچہ بعض آثار میں حضور علیہ السلام سے مروی ہے جذبۃ من جذبات الحق توازی عمل الثقلین یعنی ایک جذبہ منجملہ جذبات حق کے جن و انس کے عمل کے برابر درجہ رکھتا ہے مگر یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ازلی پر موقوف ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے دنیا کی محبت اور ماسوی اللہ کی عظمت دل سے جاتی رہے اور دشمنوں پر غلبہ ہو اور اگر چینی کے برتن پر لکھ کر ایسے شخص کو پلایا جاوے جو جادو سحر کے عورت پر قادر نہ ہو سحر دفع ہو۔

قرآنی آیت لا الہ الا اللہ الواحد القہار رب السموٰت والارض وما بینہما العزیز الغفار (حصن حصین)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْوَهَّابُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ یہ اسم مصدر وھب یھب ھبۃ سے مشتق ہے اور ھبہ کسی شخص کو کسی چیز کے بلا معاوضہ مالک کر دینے کو کہتے ہیں اور ھبہ حقیقۃً بجز ذات باری کے کوئی غیر نہیں کر سکتا کیونکہ ہبہ میں دو رکن ضروری ہیں اول کسی چیز کا مالک بنا دینا دوم بلا معاوضہ مالک بنانا سو یہ امر بندگان عاجز سے ناممکن ہے کیونکہ (۱) جب تک اللہ تعالیٰ بندہ کے دل میں کسی امر کے بجا لانے کا ارادہ اور نیت مستحکم پیدا نہ کرے بندہ خود خود کچھ نہیں کر سکتا اس لئے حقیقی فاعل وہی ذات اقدس ہو گی (۲) عاجز بندہ تو اپنے افعال کی حقیقت کے سمجھنے سے بھی عاجز ہے اس لئے وہ اپنے فعال کا خود موجد نہیں ہو سکتا بلکہ موجد در حقیقت ذات باری ہے اس لئے واہب در حقیقت بھی وہی ذات اقدس ہے (۳) اگر اللہ تعالیٰ ازل میں بندہ کے عمل ہبہ کو مقدر نہ کرتا تو بندہ اس عمل کو کبھی جامہ لا سکتا کیونکہ اس کے علم و ارادہ کے بدوں کوئی امر واقع نہیں ہو سکتا اس لئے فی الحقیقت وہی ذات جامع کمالات واہب ہو گی نہ کوئی اور (۴) عاجز بندہ تو اللہ تعالیٰ کا مملوک ہے مملوک خود کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا قال اللہ

تعالیٰ ضَرَبَ اللّٰهُ عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ اور جب بندہ خود کسی چیز کا مالک نہیں تو وہ کسی غیر کو کیونکر کسی چیز کا مالک بنا سکتا ہے؟

اب رہا دوسرا رکن سو یہ مسلم ہے کہ عاجز بندہ کبھی کوئی عمل بلا کسی معاوضہ دنیوی یا اخروی کے جا نہیں لاتا دنیوی معاوضہ میں ہر ایک قسم کا معاوضہ شامل ہے خواہ مدح و آفرین ہی سننا مقصود ہو اور اگر معاوضہ کا خیال انسان کے دل میں نہ ہوتا تو اس سے کبھی کوئی عمل بھی صادر نہ ہو سکتا حتیٰ کہ عارفان خدا کے اعمال بھی معاوضہ رضائے خدا ہونے پر مبنی ہیں جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ ہبہ کے ہر دو رکن عاجز بندہ سے صادر نہیں ہو سکتے تو وہ عمل ہبہ کا حقیقۃً عامل نہیں کہلا سکتا مگر ذات باری کی نسبت ہبہ کے ہر دو رکن صحیح طور پر ثابت ہیں۔

(۱) تملیک تو اس لئے کہ وہ خود تمام اشیاء کا خالق و مالک ہے اس لئے دوسروں کو کسی شئے کا مالک بنا سکتا ہے۔

(۲) اور بلا معاوضہ اس لئے کہ اس کی ذات ہر ایک چیز سے مستغنی ہے کسی اور شئی کو اس کی ذات سے کچھ تعلق نہیں لہذا ہبہ در حقیقت اسی ذات بے نیاز کا فعل ہو سکتا ہے نہ کسی غیر کا اور اگر مجازاً انسان کو بعض اشیاء کا واہب مان بھی لیں تو پھر بھی اس کا عمل ہبہ محدود بلکہ نہایت ہی مختصر ہو گا اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا بانجھ کو شفا دینا بے فرزند کو فرزند عطا فرمانا گمراہ کو ہدایت دینا وغیرہ ایسے امور ہیں جو بجز اس واہب حقیقی کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا بلکہ اس ذات اقدس کے عطایا اس قدر وسیع ہیں کہ کوئی شخص ان کا احاطہ نہیں کر سکتا قال اللہ تعالیٰ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا یعنی تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی حصر نہیں کر سکتے اور پھر فرمایا وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ یعنی جو نعمتیں تمہیں حاصل ہیں سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ان ہر دو آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ منعم حقیقی وہی ذات ہے اور یہ کہ ہم اس کی نعمتوں کا حصر کرنے سے عاجز ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ وہاب وہ ذات ہے جس کی عطا اور جود کی کوئی حد نہ ہو اور بلا سوال انعام کرے اور کسی حال میں کسی کو اپنی نعمت سے محروم نہ رکھے بعض لکھتے ہیں کہ وہاب وہ ذات ہے جو بلا وسیلہ انعام کرے اور بلا سبب وحیلہ عطا فرمادے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دیتا ہے اور تمام حالات میں اپنے مولیٰ کی خدمت پر محدود رہتا ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے فنا اور قبولیت اور ہیبت و بزرگی پیدا ہو اگر چاشت کے نفلوں کے آخری سجدہ میں اس کو چودہ بار کہے یہ مقاصد اس کو حاصل ہوں۔

دعاء

لا آله الا انت لا شريك لك سبحانك اللهم انى استغفرك لذنبى واسالك رحمتك اللهم زدنى علماً ولا تزغ قلبى بعد اذ هديتنى وهب لى من لدنك رحمة انك انت الوهاب (حصن حصین)

الرزاق

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ داؤد علیہ السلام کی ایک دعاء میں یوں مروی یا رازق البغاث فی عشہ یعنی اے ناتواں جانوروں کو ان کے آشیانہ میں روزی پہنچانے والے اس جملہ کی توجیہ جس میں بعض اہل تحقیق نے یوں لکھا ہے کہ کوا جب اپنے انڈوں کو توڑ کر بچے نکالتا ہے تو بچہ کی رنگت سفید ہوتی ہے جس سے کوا کراہت کرتا ہے اور بچہ کو یوں ہی چھوڑ کر اڑ جاتا ہے مچھر اور مکھیاں اس کے بدن پر آکر بیٹھتی ہیں۔ اور انہیں کو وہ اپنی غذا بناتا ہے رفتہ رفتہ جب اس کے پر و بال نکل آتے ہیں اور سیاہ نظر آنے لگتے ہیں تب کوا بھی آموجود ہو جاتا ہے اور اس سے انس پکڑتا اور اس کی تربیت کرتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح جسم انسانی بذریعہ مادی اشیاء کے جو غذا کی صورت میں ہوتی ہیں تربیت پاتا ہے اسی طرح روح انسانی معارف و اسرار سے تربیت حاصل کرتی ہے اور ہر دو کو رزق کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر رزق روحانی یعنی معارف حقہ انسان کے لئے بہترین رزق سمجھا گیا ہے کیونکہ ان سے روح انسانی قوت پاتی ہے یہ امر مسلم ہے کہ معارف و

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسرار حقہ کے انکشاف کا سب سے اعلیٰ ذریعہ نماز ہے اس لئے روحانی تربیت کے لئے ضروری ہے کہ نماز پنج گانہ مع شروط و آداب مواظبت کی جائے نماز جس طرح روحانی انکشافات کا ذریعہ ہے اسی طرح جسمانی غذا یعنی روزی کی وسعت کا اعلیٰ ذریعہ بھی ہے دیکھو اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر مداومت کرو ہم تمہاری روزی کے متکفل ہیں حضرات اہل باطن لکھتے ہیں کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنی تمام حاجات میں اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرے دیکھو جب موسیٰ علیہ السلام نے طلب دیدار کی جو ایک اہم مطلوب اور اعلیٰ مقام تھا تو رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ کہ بارگاہ رب العزت میں التجاء کی اور جب بھوک لگی تو طلب طعام کے لئے جو ایک ادنیٰ اور اخس امر ہے باخلاط رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ اسی بارگاہ معلیٰ کی طرف رجوع کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری روزی کو تمہاری طلب میں لگا دیا ہے اور تمہیں طلب جنت کا حکم دیا ہے مگر تمہارا حال اس کے برعکس ہے کیونکہ تم روزی کو طلب کرتے پھرتے ہو اور طلب جنت کو بھلائے بیٹھے ہو حضرت عیسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض ارشادات میں یوں وارد ہوا ہے کہ تم اپنے پیٹ کی فکر میں مت کڑھو پرندوں کی طرف دیکھو کہ صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو اپنے آشیانہ میں سیر ہو کر واپس آتے ہیں اور وہ تمہاری طرح نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں اگر تمہیں یہ خیال ہو کہ ہم پرندوں کی نسبت بڑے پیٹ رکھتے ہیں تو جنگل کے وحشیوں کی حالت میں غور کرو کہ تم سے زیادہ پر خوار ہیں اور وہ نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہیں ان کی روزی پہنچا دیتا ہے۔

اسم رزاق کی توجیہ میں مختلف اقوال ہیں بعض حضرات نے لکھا ہے کہ رزاق وہ ذات ہے جو ابدان کو توفیق کی غذا دیتا ہے اور ارواح کو تصدیق کی قوت عطا فرماتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اغنیاء کو تو وجود رزق کے ساتھ

مخصوص کرتا ہے اور فقراء کو شہود و رزاق کا درجہ عطا فرماتا ہے یعنی اغنیاء کی نظر نعمت پر ہوتی ہے اور اولیاء کی منعم پر بعض لکھتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اشباح (اجسام) کو فوائد لطف اور ارواح کو عوائد کشف سے عزت بخشتا ہے بعض یوں کہتے ہیں کہ رزاق وہ ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے قناعت عطا فرما کر اسے وجہ معاش کے اسباب سے روک دیتا ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ملتا ہے کہ وہ رزاق حقیقی کے مقدر پر راضی رہتا ہے اور جو کچھ پاتا ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ کما امر اللہ بہ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا اور وہ چشم بصیرت سے وصف رزاقیت کو دیکھ لیتا ہے اور اس لئے کسی غیر سے روزی کا منتظر نہیں رہتا چنانچہ حاتم اصم رحمہ اللہ کی نسبت مروی ہے کسی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے کھایا کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ سے اس شخص نے کہا کیا آسمان پر سے روٹی تم پر گرائی جاتی ہے آپ نے جواب دیا کہ ایسا تب ہوتا جبکہ زمین پر اس کے خزائن موجود نہ ہوتے اس شخص نے کہا کہ تم لوگ الفاظ کی تاویل کر لیتے ہو آپ نے فرمایا ہاں اس لئے کہ آسمان پر سے کلام ہی نازل ہوا ہے اس شخص نے کہا کہ میں آپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا آپ نے فرمایا کہ واقعی باطل حق کے سامنے عاجز ہے۔

خاصیت

عمل نماز فجر گھر کے سب گوشوں میں دس دس بار کہے اور جو گوشہ سمت قبلہ داہنی طرف ہو اس سے شروع کرے تو وسعت رزق حاصل ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْفَتَّاحُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ اور پھر فرمایا وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ یہ اسم مصدر فتح سے مشتق ہیں جس کے معنی لغت میں دروازہ کھولنے کے ہیں چنانچہ قفل کی چابی کو مفتاح کہتے ہیں قال اللہ تعالیٰ فَفَتَحْنَا اَبْوَابَ السَّمَآءِ اور لڑائی میں فتح پانے سے مراد ظفر یاب ہونا لیا کرتے ہیں قال اللہ تعالیٰ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا اس آیت میں فتح سے فتح مکہ مراد ہے ممکن ہے کہ فتح سے ظفر مراد لینا اس خیال پر مبنی ہو کہ عموماً دشمن پر کامیاب ہونے کا یہ معیار تھا کہ فاتح کی سپاہ قلعہ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاتی تھی اور جب یہ صورت ہوا کرتی تو سمجھ لیا جاتا کہ دشمن مغلوب ہو گیا۔

اس اسم کی توجیہ دو طرح کی گئی ہے اول تو یہ کہ فتاح وہ ذات ہے جو اپنی مخلوقات کے درمیان فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اس نے حق کو باطل سے علیحدہ کر دیا ہے اور اس لئے وہ فتاح ہے دوم یہ کہ فتاح وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر خیر و سعادت کے دروازے کھول دیتی ہے اور ان کی مشکلات کو آسان کر دیتی ہے پھر ایسی آسانی یا تو امور دین کے متعلق ہو گی

جیسے علوم شرائع و دیانات کا عطا فرمانا یا امور دنیا میں جیسے فقیر کو غنی بنانا یا کسی مصیبت زدہ کی مصیبت کو دور کرنا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ فتاح وہ ذات ہے جو قلوب اہل ایمان پر اپنی معرفت کے اور اہل معصیت پر اپنی مغفرت کے دروازے کھول دے اور بعض لکھتے ہیں کہ فتاح وہ ذات ہے جو مصائب میں اعانت کرے اور وجود احسان کو آسان بنائے بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ فتاح وہ ذات ہے جو باب توفیق کو نفوس پر کھول دے اور اسرار و معارف کی تحقیق عطا فرمادے بعض نے لکھا ہے کہ فتاح وہ ذات ہے جو بندوں کے عصیان پر عطاء نعمت کو بند نہیں کر لیتی اور ان کے نسیان پر اپنی رحمت کو موقوف نہیں کرتی بعض نے کہا ہے کہ فتاح وہ ہے جس کا حکم قطعی اور اس کی مشیت اٹل ہو۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہے کہ وہ مجاہدت کو ایسا کامل کرے کہ ابواب مکاشفات اس پر مفتوح ہو جائیں اور لوگوں کو خیر و سعادت کا اضافہ کرے۔

خاصیت

بعد نماز فجر سینہ پر ہاتھ رکھ کر ستر بار پڑھے تمام امور میں آسانی ہو اور قلب میں طہارت و نورانیت ہو اور رزق میں آسانی ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْعَلِیْمُ

جل جلالہ

مصدر علم سے کئی ایک صیغے ذات باری نے اپنے لئے قرآن مجید میں استعمال کئے ہیں اول وہ صیغے جن سے صفت علم کا ذات باری کے لئے اثبات ہوتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ پھر فرمایا وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اور پھر فرمایا اَنْزَلَہٗ بِعِلْمِہٖ دوم صیغہ عالم ہے چنانچہ فرمایا عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اور نیز فرمایا عَالِمُ غَیْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سوم صیغہ علام چنانچہ فرمایا اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ چہارم صیغہ اعلم چنانچہ فرمایا رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِکُمْ اور پھر فرمایا اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ پنجم صیغہ علم باب تفعیل سے چنانچہ فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ پھر فرمایا وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ مگر جمیع علماء امت نے اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ گو باب تفعیل سے کئی ایک صیغے ذات باری کے لئے قرآن مجید میں آچکے ہیں مگر ہم اس ذات اقدس کو معلم بصیغہ اسم فاعل تعبیر نہیں کر سکتے اس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسماء ذات باری شرعی ہیں نہ قیاسی شروع کتاب میں اس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے اس مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نسبت بعض مقامات

میں بعض الفاظ ایسے وارد ہوئے ہیں جن سے ان کے حق معصیت کا گمان پیدا ہوتا ہے اور اس لئے ہم ان پر عاصی یا مذنب کا لفظ اطلاق کر سکتے ہیں یا نہیں مثلاً عَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی سو کیا ہم آدم علیہ السلام کو عاصی کہہ سکتے ہیں یا دختر شعیب علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام کی نسبت قرآن مجید میں وارد ہوا ہے یَا اَبَتِ اسْتَاْجِرْہُ (اے باپ موسیٰ کو اجرت پر رکھ لو) کیا ہم موسیٰ علیہ السلام کی نسبت اجیر (مزدور) کا لفظ بول سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ جس طرح معنی کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے اسی طرح ادب کا ملحوظ رکھنا بھی واجب ہے۔

ششم صیغہ علیم ہے قال اللہ تعالیٰ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یہ امر بالکل واضح ہے کہ ان مختلف صیغوں کا مفہوم بھی مختلف ہے اور ان کی بناء کا مختلف ہونا ان کے مختلف المفہوم ہونے پر کافی دلیل ہے چنانچہ علیم جو وزن فعیل پر ہے مبالغہ کے لئے موضوع ہے اور بمقابلہ عالم اپنے ماخذ (علم) پر قوی طور پر دلالت کرتا ہے اور اس کی مثال بعینہ سامع اور سمیع اور راحم اور رحیم کی سی ہے مع ھذا فعیل کا وزن ثبوت اور استمرار پر دلالت کرتا ہے اور آیۃ وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صیغہ علیم صیغہ ذی علم سے زیادہ مبالغہ پر مشتمل ہے۔

واضح ہو کہ مصدر علم سے صیغہ علامہ بھی مشتق ہوتا ہے اور یہ لفظ گو مبالغہ کے لئے ہے مگر ذات باری پر اس کا اطلاق نہیں ہو اور نہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے چنانچہ کسی بڑے عالم کی نسبت تو یہ کہہ سکتے ہیں ھو علامۃ مگر ذات باری کی نسبت نہیں بول سکتے اس صیغہ کے آخر میں حرف ہا مبالغہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور ذات باری کی نسبت اس کے عدم استعمال کی وجہ یہ ہے کہ یہ صیغہ ایسے شخص کے حق میں بولا جاتا ہے جس نے حالت نقصان سے حالت کمال تک ترقی کی ہو اور یہ امر ذات باری کی نسبت متصور نہیں یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذات باری کے علم کی حقیقت انسانی علم کی سی نہیں اور ان ہر دو

toobaa-elibrary.blogspot.com

میں بوجوہ چند اختلاف ہے اول یہ کہ ذات باری کا علم ایک ہی علم ہے جس سے وہ تمام جزئیات عالم کا علم رکھتا ہے مگر انسان کا علم ایسا نہیں کیونکہ اس کو ہر ایک چیز کی نسبت علیحدہ علم کی ضرورت پڑتی ہے دوم ذات باری کا علم غیر متبدل ہے اور انسانی علم متغیر ہو جاتا ہے سوم ذات باری کا علم بذریعہ حواس اکتساب نہیں کیا جاتا بلکہ اس کا علم ذاتی ہے اور انسان کا علم بواسطہ حواس اکتساب کیا جاتا ہے چہارم ذات باری کا علم ممتنع الزوال ہے اور انسان کا علم ممکن الزوال پنجم ذات باری کا ایک علم اس کو کسی دوسرے علم سے روک نہیں سکتا مگر انسان کو یہ بات حاصل نہیں ششم ذات باری کا علم غیر متناہی ہے اور انسان کا علم متناہی ہے بعض حضرات نے لکھا ہے کہ علیم وہ ذات ہے جس پر کوئی امر مخفی نہ ہو سکے اور کوئی قریب و بعید امر اس پر مستور نہ ہو اس لئے جو شخص اس ذات کی نسبت ایسا یقین رکھتا ہے وہ کبھی مصیبت سے دل آزردہ اور شاکی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہمیشہ اس کے احسان کا شکر گذار اور اپنے گناہوں کی بابت عذر خواہ رہتا ہے امام غزالی فرماتے ہیں کہ علم ذات باری کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر ایک چیز پر ظاہر ہو یا باطن صغیر ہو یا کبیر اول ہو یا آخر الغرض تمام اشیاء پر محیط ہے اور وہ منتسب نہیں بلکہ دیگر علوم اس کے علم سے مستفاد ہیں کیونکہ انسان کا علم اشیاء خارجیہ سے اخذ کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تو تمام اشیاء کا خالق ہے اور وہ انہیں ان کے وجود سے پہلے سے جانتا ہے کیونکہ اس کا خالق الاشیاء ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ قبل از وجود ان کا علم رکھتا تھا اور اس کی مثال یوں سمجھو کہ شطرنج کا واضع وضع شطرنج سے پہلے اس کا علم رکھتا تھا کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ وضع نہ کر سکتا مگر ہمارا علم شطرنج کی نسبت شطرنج کے وجود سے اخذ کیا گیا ہے اس لئے ہمارا اور واضع کا علم ایک نہیں ہو سکتے۔

پھر لکھتے ہیں کہ انسان کا شرف علم ہی سے ہے اور علم اشرف وہ ہے جس کا موضوع یا معلوم اشرف ہو اور جس قدر کوئی معلوم شریف ہو گا اسی قدر اس کا علم بھی دیگر علوم کی نسبت شریف سمجھا جائے گا چونکہ ذات باری اشرف

المعلومات ہے اس لئے ذات باری کا علم حاصل کرنا جس کو معرفت الٰہی کہتے ہیں تمام علوم کی نسبت اشرف ہے اور دیگر اشیاء کے علوم بھی اس لئے شریف سمجھے جاتے ہیں کہ وہ معرفت الٰہی کا ذریعہ بنتے ہیں کیونکہ اشیاء کا وجود افعال ذات باری کا نتیجہ ہے اس لئے افعال ذات باری کی معرفت در حقیقت ذات باری کی معرفت ہے اس لئے معلوم ہوا کہ جو چیز واسطہ معرفت الٰہی ہو اس کا علم بھی شریف ہو گا اسی خیال پر علم فقہ و حدیث تمام دیگر علوم کی نسبت اشرف سمجھے جاتے ہیں۔

خاصیت

اس کی کثرت و مداومت سے حقائق و معارف منکشف ہوتے ہیں اور حافظہ قوی ہوتا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْقَابِضُ الْبَاسِطُ

جل جلالہ　　جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ ان ہر دو اسماء کا ذکر یک جا لانا ضروری ہے کیونکہ کمال قدرت اس امر کا مقتضی ہے کہ ہر دو متضاد پہلو پر حاوی ہو مع ھذا اگر صرف القابض کا ذکر بدوں الباسط کے کریں تو اللہ تعالیٰ کو صرف صفت منع و حرمان کے ساتھ ذکر کرنا لازم آئے گا اور یہ جائز نہیں۔

قبض وبسط کے لغوی معنی علیحدہ علیحدہ تنگ پکڑنے اور فراخ کرنے کے ہیں اور یہ معنی تمام اشیاء موجودات کو احاطہ کئے ہوئے ہیں چنانچہ مولود ذیل قابل غور ہیں۔

(۱)　اللہ تعالیٰ رزق میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ یعنی اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے اور اس فراخی اور تنگی میں اس کی مصلحتیں ہیں جن کو وہی بہتر جانتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَوْبَسَطَ اللّٰہُ الرِّزْقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے روزی کو فراخ کر دیتا تو زمین میں ظلم کرنے لگ جاتے مگر وہ اپنی

حکمت کاملہ سے اسی قدر عطا فرماتا ہے جس قدر مناسب ہوتا ہے۔

(۲)　بادلوں میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے چنانچہ فرمایا اَللّٰہُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُہٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہواؤں کو چھوڑتا ہے پھر وہ ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر انہیں آسمان میں (خلاء میں) جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔

(۳)　سایہ و نور میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ قَبَضْنٰہُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا یعنی پھر ہم اس سایہ کو تھوڑا تھوڑا اپنی طرف سمیٹتے چلے آتے ہیں۔

(۴)　ارواح میں قبض وبسط پیدا کرتا ہے قبض تو موت کے وقت اور بسط حیات کے وقت۔

(۵)　زمین میں قبض وبسط قال اللہ تعالیٰ وَالْاَرْضَ جَمِیْعًا قَبْضَتُہٗ اور نیز فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِہٰدًا ای بساطاً

(۶)　قبض صدقات قال اللہ تعالیٰ یَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ والاخذ ممنے القبض

(۷)　قبض وبسط قلوب

واضح ہو کہ قلوب میں قبض وبسط کی حالت بعینہ خوف و رجا کی حالت سے مشابہ ہوتی ہے کیونکہ خوف کسی امر ناگوار کے زمانہ مستقبل میں وقوع کے متعلق ہوتا ہے اور رجا کسی امر مطلوب کے حصول کے متعلق البتہ قبض وبسط میں ماضی و مستقبل نہیں ہوتا اور خوف و رجا میں زمانہ مستقبل کا تعلق ضروری ہے جس طرح خوف و رجا میں قوت وضعف کے لحاظ سے مدارج ہوتے ہیں اسی طرح قبض وبسط کے بھی مدارج مختلفہ ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ موجب قبض بعض اوقات تو معلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات نامعلوم ایسی حالت میں بجز تسلیم کچھ چارہ نہیں کیونکہ حضرات مشائخ نے لکھا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر سالک قبض کے دور کرنے میں کوشش کرے تو قبض اور بھی بڑھ جاتی ہے اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

جب تسلیم اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ فی الفور زائل کر دیتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں الخوف یقبضنی والرجاء یبسطنی فاذا قبضنی الخوف افنانی واذا بسطنی الرجاء احیانی یعنی خوف میرے لیے موجب قبض ہے اور رجا موجب بسط سو حالت قبض میں مر جاتا ہوں اور حالت بسط زندہ ہو جاتا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ اس ذات قدس کا جلال موجب قبض اور جمال موجب بسط ہے ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آدم علیہ السلام کو حکم دے گا کہ اہل جہنم کو جہنم کی طرف چلاؤ آدم علیہ السلام عرض کریں گے خدایا کس قدر افراد کو جہنم کی طرف چلاؤں حکم ہو گا کہ ہزار میں سے نوے ننانوے اہل جہنم ہیں حضور علیہ السلام کا یہ کلام سن کر صحابہ سخت پریشان ہوئے اور جب صبح ہوئی اور حضور انور نے انہیں مغموم پایا تو فرمایا کہ تمہاری تعداد تمام گذشتہ امتوں کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتی ہے جو سفید بیل کے جسم پر سیاہ خال کو اس کی سفیدی جسم سے ہوتی ہے اس ارشاد نبوی کے پہلے حصہ سے صحابہ کے قلوب میں قبض پیدا ہو گئی تھی اور دوسرے حصہ سے بسط کیونکہ پہلے حصہ میں جلال اور دوسرے میں جمال کی طرف اشارہ ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ قابض وہ ذات ہے کہ جو اپنے جلال کو قلب سالک پر مسلط کرے اور باسط وہ ذات ہے جو اپنے جمال کو قلب سالک پر منکشف کرے بعض لکھتے ہیں کہ قابض وہ ذات ہے جو اپنے فراق کا بندہ کو خوف دلائے اور باسط وہ ذات ہے جو اپنے عفو سے اس کو امن بخشے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں بندگان خدا میں سے قابض و باسط وہ شخص ہوتا ہے جس کے قلب پر حکمت کے عجائبات منکشف ہوں اور اسے ایسا کلام عطا کیا جاوے جو باوجود اختصار کے نہایت جامع ہو ایسے کلام کو جوامع الکلم ہوتے ہیں۔ سو کبھی تو یہ شخص عباد اللہ کو دلائل رجا سے بسط اور کبھی دلائل

خوف سے قبض کا افادہ کرتا ہے۔

خاصیت

(القابض) چالیس روز روٹی کے لقمہ پر اس کو لکھ کر کھاوے تو بھوک سے تکلیف نہ ہو۔

(الباسط) نماز چاشت کے بعد دس بار پڑھنے سے رزق میں فراخی ہو۔

دعاء

یا من اظهر الجميل وستر القبيح ويا من لا يواخذ بالجريرة ولا يهتك الستر يا عظيم العفو يا حسن التجاوز يا واسع المغفرة يا باسط اليدين بالرحمة يا صاحب كل نجوى يا منتهى كل شكوى يا كريم الصفح يا عظيم المن يا مبتدى النعم قبل استحقاقها يا ربنا ويا سيدنا ويا مولانا وياغاية رغبتنا اسالك يا الله ان لاتشوى خلقى بالنار. (حصن حصين)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْخَافِضُ الرَّافِعُ

جل جلالہ جل جلالہ

خفض کے معنی لغت میں پست کرنے اور رفع کے معنی بلند کرنے کے ہیں قال اللہ تعالیٰ یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ اور قیامت کی صفت میں فرمایا خافضۃ رافعۃ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ دین میں خفض و رفع سے اضلال و ارشاد مراد ہے خواہ معرفت ذات باری کے متعلق ہو یا طاعت کے متعلق اور دنیا میں رفع و خفض سے درجات بلند کرنا اور ساقط کرنا مراد ہوا کرتی ہے اور قیامت کو خافضہ رافعہ اس لئے کہا گیا ہے کہ کفار کو اسفل درکات جہنم میں اور ابرار کو اعلیٰ درجات جنت میں لے جائے گی اس لئے یہ ہر دو اسماء ذات باری کے صفات افعال میں سے شمار کئے گئے ہیں۔

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں ایک قوم کے لئے اہانت مقدر کر دی اور دوسری کے لئے اعانت اس لئے وہ ایک کے لئے خافض اور دوسری کے لئے رافع ہے انسان کامل کو ان سے یہ بہرہ ہے کہ وہ جانب روح کو جانب نفس پر بلند رکھتا ہے اور اولیاء اللہ کی نصرت اور اعداء اللہ کی مخالفت کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رافع وہ ذات ہے جو اولیاء کو اعلیٰ درجات عطا فرما کر انہیں اپنا مقرب بنائے اور اعداء کو اپنی بارگاہ سے دور رکھے۔ یا یوں کہو کہ اولیاء کو محسوسات اور شہوت سے بالا تر لے جا کر گروہ ملائکہ میں داخل کر دے اور اعداء کو لذات حیوانیہ دنیویہ میں مبتلا رکھے۔

خاصیت

(الخافض)

پانچ سو بار پڑھنے سے حاجت پوری ہو۔

(الرافع)

ستر بار پڑھنے سے ظالموں سے امن میں ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُعِزُّ الْمُذِلُّ

جل جلالہ جل جلالہ

یہ ہر دو اسم بھی یکجا ذکر کئے جاتے ہیں ایک کا بدوں دوسرے کے ذکر کرنا ذات باری کے حق میں موجب نقص ہے قال اللہ تعالیٰ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ان ہر دو اسماء کی توجیہ کے لئے اب میں غور کرنا چاہیے کہ انسان کا کمال اس امر میں ہے کہ ذات حق کی معرفت محض ذات حق کے لئے حاصل کرے اور امر خیر کی حقیقت کو اس لئے سمجھے کہ اس پر عامل ہو موجب بندہ صبر کو یہاں تک لازم پکڑ لے کہ انوار ربوبیت کے مشاہدہ میں مستغرق ہو جائے اور ماسوی اللہ سے اس کی التفات منقطع ہو جائے تو اس کو حقیقی اعزاز کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور اگر اس کی حالت اس کے برخلاف ہو تو مقام اذلال میں ٹھہرتا ہے اور ان ہر دو میں بہت سے مدارج ہیں جو مشاہدہ انوار ربوبیت کی نسبت کی رو سے مختلف ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ عزت مطلق کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ تمام ماسوائے اللہ سے احتیاج کو منقطع کر لے اور چونکہ عدم احتیاج مخصوص بذات باری ہے اس لئے حقیقی عزت کا مالک بھی وہی ہے قال اللہ تعالیٰ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعاً

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معز ذل سے وہ ذات اقدس مراد ہے جو اپنی مشیت ازلی کے مطابق جس کو چاہتا ہے ملک حقیقی کا مالک بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم رکھتا ہے اور ملک حقیقی سے مراد ذلت احتیاج اور غلبہ شہوت سے نجات پانا ہے ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ حضیض جہل سے نکال کر اوج معرفت پر ترقی عطا فرماتا ہے سو جس کے قلب پر سے اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دیتا ہے اور جمال حضرت باری کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور مقام قناعت میں اس کو استقامت حاصل ہو جاتی ہے اور تمام مخلوقات سے بے نیاز ہو کر خداوندی تائید سے صفات نفس پر غالب آجاتا ہے وہ در حقیقت حقیقی عزت کا مالک ہے اس عالم دنیا میں بھی اور عالم آخرت میں بھی ایسے ہی شخص کو دنیا سے رخصت ہوتے وقت خطاب کیا جاتا ہے يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ یعنی اے نفس مطمئنہ (جس کی اوپر تعریف ہو چکی ہے) اپنے رب کی طرف لوٹ اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے راضی ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہے۔ سو آج تو میرے مقبول بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جابر خلاف اس کے ذلیل وہ شخص ہے جو عاجز مخلوق کا محتاج رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دیئے پر قناعت نہ کر کے حرص کا کتا بن جاتا ہے اور دربدر مارا پھرتا ہے سو ایسا شخص ہمیشہ ظلمت جہل میں گرفتار رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے سلطنت عزت کو چھین لیتا ہے اور یہی حقیقی ذلت ہے اور اس ذلت کا مداوی شخص ہے جس کو یوں خطاب کیا جائے گا وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ الآیۃ یعنی تم لوگ نفس امارہ کی خواہشات میں مبتلا رہے اور ناپائیدار لذتوں کے پیچھے پڑے رہے ہو۔

ہر سود و کاں ز در خویش براند
وآنرا کہ خواند بدر کس نہ داند

یہاں تک تو اس عزت و ذلت کا ذکر تھا جس کو روح انسانی سے تعلق

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے جسمانی عزت و ذلت کا معیار یہ ہے کہ جس شخص کو صحت و عافیت مال و جاہ شرف نسب کثرت انصار حاصل ہو وہ عزت کا مالک ہے اور جس کو یہ باتیں نصیب نہ ہوں وہ ذلیل ہے اس توجیہ کے مطابق اعزاز و اذلال صفات افعال میں داخل ہیں۔

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ معز وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کو عزت عصمت سے امتیاز بخشے اور پھر اپنی رحمت سے انہیں مغفرت عطا فرمائے اور دار آخرت میں اپنے مشاہدہ جمال سے محظوظ و مسرور کرے اور مذل وہ ذات ہے جو اپنی معرفت سے اپنے اعداء کو محروم رکھے اور انہیں اپنی معصیت کی طرف لگا کر انہیں مستحق لعنت بنائے اور جہنم میں جھونک دے بعض حضرات لکھتے ہیں کہ معز وہ ذات ہے جو بندہ کو ذلت نفس پر آگاہ کر کے اس کو عزت بخشے اور مذل وہ ذات ہے جو بندہ کو عزت نفس کے غرور میں مبتلا کر کے اس کو ذلیل کر دے۔

خاصیت

(المعز)

شب دو شنبہ و شب جمعہ کو بعد مغرب چالیس بار پڑھنے سے اس کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو۔

(المذل)

۷۵ بار پڑھ کر سر بسجود ہو کر دعا کرے تو حاسد کے حسد سے محفوظ رہے اور جس کا حق دوسرے کے ذمہ آتا ہو اور وہ اس میں ٹال مٹول کرتا ہو اس کو بکثرت پڑھنے سے وہ اس کا حق ادا کرے۔

اَلسَّمِیْعُ

جل جلالہ

آیۃ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان ہر دو اسم کا مفہوم ایک نہیں کیونکہ ایک ہونے کی صورت میں تکرار بلا افادہ لازم آتا ہے سمع کی حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک علمی انکشاف ہے جو کسی سامع کو بذریعہ صوت کے حاصل ہو مگر یہ حقیقت ذات باری کی نسبت صحیح نہیں کیونکہ اس کا علم باہر سے مکتسب نہیں بلکہ ذاتی ہے اور یہ امر کچھ حقیقت سمع ہی سے مخصوص نہیں بلکہ دیگر معلومات کی نسبت بھی ایسا ہی خیال کیا جا سکتا ہے مثلاً ہماری بصرات کا علم بذریعہ قوت باصرہ باہر سے آتا ہے اور ذات باری کے لئے ایسا قیاس کرنا غلط ہے بلکہ ذات باری کے معلومات کو ہمارے معلومات سے وہی نسبت ہے جو خود ذات باری کو ہماری ذات سے نسبت ہے الغرض سمع اور بصر وغیرہ صفات صرف بطور اشتراک لفظی ہمارے اور ذات باری کی نسبت بولے جاتے ہیں ورنہ ان کی حقیقت ایک نہیں ہمارے صفات ناقص حادث معلول ہیں اور ذات باری کے صفات ان عیوب سے بری ہیں جو لوگ مادی اشیاء سے بالاتر حقائق کا ادراک نہیں کر سکتے ان کا علم صفات باری کی نسبت نہایت ضعیف ہے حالانکہ وہ ذات

toobaa-elibrary.blogspot.com

مقدس اپنی مخلوق اشیاء اور ان کے صفات کی مناسب سے بالاتر ہے اور لیس کمثلہ شی اس کا وصف ذاتی ہے سمیع بمعنے قبول و اجابت بھی مستعمل ہے چنانچہ ایک دعائے ماثورہ میں یہ لفاظ وارد ہوئے ہیں اللھم انی اعوذبک من قول لایسمع ای من دعاء لایستجاب اور نماز میں کہا جاتا ہے سمع اللہ لمن حمدہ ای قبل اللہ حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ سمیع ذات باری کو اس لئے بول جاتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی عاجزی اور فروتنی پر متوجہ ہوتا ہے اس کو ایک بندہ کی پکار دوسرے بندہ کی پکار سننے سے نہیں روک سکتی بعض لکھتے ہیں کہ اس اسم کی توجیہ یوں ہے کہ ذات باری عین اضطرار کے وقت اپنے بندوں کی پکار کو سنتا ہے اور ان کی مصیبت کو دور کرتا ہے اور طالب مغفرت کو مغفرت عطاء فرماتا ہے اور عذر کرنے والے کا عذر مانتا ہے امام غزالی فرماتے ہیں کہ انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کو جب سمیع ذات باری کی حقیقت کا پتہ لگ جاتا ہے تو وہ اپنی زبان کی محافظت کرتا ہے اور کبھی کوئی کلمہ ناجائز یا عبث منہ سے نہیں نکالتا اور وہ اپنی سمع کو کلام الٰہی کے سننے میں مشغول کر کے ہدایت کا ذخیرہ جمع کرتا ہے۔

خاصیت

جمعرات کے روز بعد نماز چاشت پانچ سو مرتبہ پڑھ کر جو دعا کرے قبول ہو

اَلْبَصِیْرُ

جل جلالہ

بصیر فعیل کا وزن ہے جس کے معنے بصر کے ہیں جیسے الیم بمعنے مؤلم درد دینے والا ذات باری کی حقیقت بصر کو حقیقت سمع پر قیاس کرنا چاہیے یعنی جس طرح سمع ذات باری انسانی سمع سے بالاتر ہے اور محض بطور اشتراک اسی ہر دو پر سمع کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے اسی طرح اس کی حقیقت بصر انسانی بصر سے بالکل علیحدہ ہے کیونکہ انسانی بصر تو حدقہ حلقہ چشم اور الوان و صور سے منطبع ہونے کی محتاج ہے مگر ذات باری ان اشیاء کی محتاج نہیں اس لئے بصر ذات باری کی حقیقت ایک ایسی صفت ہے جس سے ذات باری کے سامنے ایک ایک ذرہ کائنات کا بلکہ اس سے بھی زیادہ دقیق اشیاء از خود منکشف ہیں اور یہ انکشاف اس درجہ کمال پر ہے اس سے زیادہ ناممکن اور غیر متصور ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جو شخص ذات باری کی حقیقت بصر سے آگاہ ہو جاتا ہے وہ اپنے باطن کو مراقبہ اور ظاہر کو محاسبہ سے آراستہ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی معصیت کرنا چاہو تو ایسی جگہ کرو کہ جہاں وہ تمہیں نہ دیکھتا ہو اور بعض یوں لکھتے ہیں کہ سمیع وہ ذات ہے جو باطن کے راز اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

مخفی مضمونوں سے مطلع ہو اور پھر وہ ذات ہے جو تحت الثرے سے عرش بریں تک کے اشیاء کو دیکھتا ہو انسان کامل کو اس سے دو قسم کا بصرہ ہوتا ہے اول حس ظاہری کے لحاظ سے جس میں وہ دیگر حیوانات کے ساتھ شریک ہے اور یہ بصرہ بہت کم درجہ کا ہے کیونکہ محسوسات کے ادراک سے زیادہ کچھ مفید نہیں دوم نور بصیرت جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اس بات کا یقین کر لے کہ بصارت عجائبات کائنات میں جو زمین و آسمان میں موجود ہیں غور کر کے عبرت حاصل کرنے کے لئے دی گئی ہے چنانچہ مسیح علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ مخلوقات میں کوئی آپ کا مثل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کی نظر عبرت اور کلام ذکر الٰہی ہو وہ میرا مثل ہے اسم بصیر کا ایک حظ یہ بھی ہے کہ عبد کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے اس لئے اس سے کوئی معصیت سرزد نہیں ہوتی اور جو شخص لوگوں سے معصیت کو چھپاتا ہے اور اس کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے وہ در حقیقت سخت گستاخ اور زیاں کار ہے اور اگر اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے نہیں دیکھتا تو وہ کافر ہے مراقبہ جو ثمرہ ایمان ہے اسم بصیر ہی کی حقیقت پر مطلع ہونے کا نتیجہ ہے اور احسان بھی اسی اسم کی حقیقت کا نتیجہ ہے جس کی نسبت حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح پر عبادت کرو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اتنا تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

خاصیت

بعد نماز جمعہ کے سو مرتبہ پڑھنے سے بصیرت میں صفائی اور نیک اعمال کی توفیق ہو۔

اَلْحَکَمُ

جل جلالہ

زجاج نحوی کہتے ہیں کہ حاکم اور حکم کا مفہوم ایک ہی ہے جیسے واسط اور وسط اور حکم لغت میں منع یعنی کسی کو کسی امر سے روکنے کے لئے مستعمل ہے چنانچہ حکمہ لگام کو بولتے ہیں کیونکہ گھوڑے کو روکتی ہے اور حکمت بمعنی دانش ہے کیونکہ آدمی کو سفاہت سے روکتی ہے اور یہی معنی حکم میں ملحوظ ہیں کیونکہ مدعی اور مدعا علیہ کو تعدی سے روکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے وصف حکم کو ثابت کیا ہے چنانچہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِیْنَ اور اَلَا لَہُ الْحُکْمُ اور لَہُ الْحُکْمُ وغیرہ الفاظ قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اس لئے حاکم اور حکم کے معنی ایسی ذات کے ہیں جس کا فیصلہ قطعی ہو اور اس کو کوئی رد نہ کر سکے اللہ تعالیٰ کے حکم کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے کہ کس طرح اس نے سعادت و شقاوت کے اسباب کا سلسلہ دنیا میں قائم کر دیا ہے قضا و قدر در حقیقت حکم ذات باری پر مترتب ہیں اور انہیں پر یہ تمام سلسلہ کائنات کا چل رہا ہے جس نے حکم ازلی سے اسباب کلیہ کو وضع کر کے ان کے مسببات کو ان کے متعلق کر دیا ہے اور مسببات کو اسباب کے متعلق کرنے سے یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی مشیت ازلی کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

مطابق محدودہ مقدرہ محسوبہ مناسبہ تحریکات حوادث کے متعلق آناً فاناً پیدا کرتا رہتا ہے اس لئے سعادت و شقاوت کے متعلق بھی ایک ایک آن میں مناسب اسباب ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں مطلقاً بالحاظ کمیت و کیفیت کے کمی بیشی کو دخل نہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی امر احاطہ قضاء و قدر سے خارج نہیں جب اللہ تعالیٰ کسی کے حق میں سعادت کا حکم نافذ کرنا چاہتا ہے تو اس کے اسباب مناسبہ کو متوجہ کر دیتا ہے علیٰ ہذا شقاوت کے اسباب مناسبہ کو بھی اسی طرح ظہور میں لاتا ہے اسباب سعادت قلب بسط وانشراح اور اسباب شقاوت قبض و انغلاق کا موجب ہو کر حکم ازلی کو پورا کر دیتے ہیں نظر دقیق اس امر کا فیصلہ کرتی ہے کہ تمام امور عالم کا انتظام سلسلہ اسباب و مسببات سے وابستہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کا ایک اندازہ مقرر فرما رکھا ہے اور تمام عالم بمنزلہ ایک کل کے ہے جس کے پرزے اپنی اپنی جگہ حرکت کر رہے ہیں اور نتیجہ معینہ ظہور پذیر رہتا ہے زمین و آسمان چاند اور سورج عناصر اربعہ کی کل کے لئے بمنزلہ پرزوں کے ہیں مثلاً غور کرو کہ آفتاب جب اپنی حرکت میں افق مشرق پر نمودار تو دنیا میں روشنی پھیل جاتی ہے اور لوگ اس کی روشنی میں اپنے کاروبار کو سرانجام دیتے ہیں اور اس کی حرارت سے نباتات و جمادات تربیت پاتے ہیں اور جب مغرب میں چلا جاتا ہے تو لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر آرام لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور جب وسط آسمان یعنی خط استواء سے قریب آجاتا ہے تو موسم گرما میں ضروری پیداواریں تیار ہوتی ہیں اور جب خط استوا سے دور چلا جاتا ہے تو موسم زمستان میں سردی پڑنے لگتی ہے اور اس موسم کے متعلقہ نباتات نشوونما پاتی ہیں اور جب خط استواء اور قطب شمالی یا قطب جنوبی کے درمیان ہوتا ہے تو اعتدال کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر دو موسم بہار یعنی ربیع و خریف کا دورہ ہوتا ہے فصول اربعہ کے یہ تغیرات گو ایسے واضح امور ہیں جن سے ہر ایک شخص واقف ہے مگر ان کے ذیل میں ہزاروں عجائبات کا مخفی خزانہ ودیعت رکھا گیا ہے جن سے ذات باری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نظام کائنات کا ثبوت ملتا ہے اور یہ سب کچھ

مشیت ازلی پر مبنی ہے قال اللہ تعالیٰ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ یعنی شمس و قمر کے حرکات ایک اندازہ معین پر رکھے گئے ہیں جس کے مطابق عالم کائنات میں لاکھوں حوادث ضروریہ کا وقوع ہوتا رہتا ہے اور اس حسبان میں اشارہ ہے اسی مشیت ازلی کی طرف جس پر قضاء و قدر کے احکام مرتب ہوتے رہتے ہیں اسی کو تدبیر اول ہوتے ہیں مذکورہ بالا تقریر سے مسئلہ جبر و اختیار کی صورت بھی واضح ہو سکتی ہے وہ لوگ جو حقیقت تقدیر کا انکار کیا کرتے ہیں اور انسان کو مختار مطلق مانتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ انسان خود اپنے ارادہ کے مطابق کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں کوئی کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کرتا اور قرآن مجید میں یوں وارد ہوا ہے مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ یعنی جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو شخص چاہے انکار کر دے اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان خود مختار ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی جبر نہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم مان لیں کہ کسی امر کے کرنے یا نہ کرنے کا انسان کو اختیار ہے اور وہ آزاد محض ہے تو اس ارادہ کی علت کیا ہے جس پر اس کا کرنا یا نہ کرنا مبنی ہے کیا اس ارادہ کا پیدا کرنا بھی انسان کا فعل مانا جاوے تو اس ارادہ کے لئے بھی ارادہ کی ضرورت ہوگی علیٰ ہذا القیاس تسلسل لازم آئے گا جس کے مان لینے پر لازم آئے گا کہ انسان سے کبھی کوئی فعل ہی وقوع میں نہ آسکے لہذا ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ انسان اپنے افعال میں مختار مطلق نہیں بلکہ تابع مشیت الٰہی ہے رہا مذکورہ بالا آیت سے استدلال سو وہ نہایت استحکام کے ساتھ مشیت الٰہی کو ثابت کر رہی ہے کیونکہ اس میں گو بظاہر مشیت انسان کو مطلق ثابت کیا ہے مگر دوسری آیات سے اس کا مقید ہونا خود ثابت ہو رہا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ اس لئے مذہب صحیح یہی ہے کہ انسان اضطرار و اختیار کے مابین رکھا گیا ہے یعنی ہم فاعل ہیں مگر ہمارا فعل مشیت ذات باری پر موقوف رکھا گیا ہے کیونکہ ہماری مشیت معلول ہے مشیت باری کا اور اس ایک حدیث سے اس کی تائید یوں ہوتی ہے۔ قلب المومن بین

toobaa-elibrary.blogspot.com

اصبعین من اصابع الرحمن یعنی مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان رکھا ہے جس طرح چاہتا ہے اسے پھرا دیتا ہے گو یہ حدیث مجملہ متشابہات کے ہے مگر محققین متاخرین نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ دو انگلیوں سے خیر و شر کے وہ دو سبب مراد ہیں جو ارتکاب فعل یا ترک فعل کا موجب ہوتے ہیں اور قلب ان ہر دو سبب کے درمیان رکھا گیا ہے اگر سبب فعل مشیت باری سے حاصل ہو جائے تو ارتکاب فعل ہو جاتا ہے اور اگر سبب ترک موجود ہو تو فعل ظہور میں نہیں آسکتا یہی وجہ ہے کہ ایک دعائے نبوی میں یہ الفاظ مروی ہیں۔ یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک اور اگر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ قلب (دل) قلب کہنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اسباب مختلفہ کے پیش آنے پر ایک حال سے دوسرے حال کی طرف مقلب ہوتا رہتا ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ چشم بصیرت سے دیکھ لیتا ہے کہ تمام امور مقدرہ حسب مشیت ازلی جاری ہیں جن میں کمیت و کیفیت کے رو سے کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا سو جب اس کو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ مقدر ازلی اٹل ہے تو اس کو مستقبل سے کچھ سروکار نہیں ہوتا بلکہ جو حالت اس پر گذرتی ہے اس کو سابقہ ازلی کا نتیجہ سمجھ کر مطمئن رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا ہے من عرف سر اللہ فی القدر ھانت علیہ المصائب جو شخص اللہ تعالیٰ کے راز قضاء و قدر کو جان لیتا ہے اس پر مصائب آسان ہو جاتے ہیں اور پھر فرمایا المقدور کائن والہم فضل یعنی امر مقدر کا وقوع ضروری ہے اور کوشش و محنت امر زائد ہے اس جملہ کا یہ مطلب نہیں کہ کوشش و محنت مقدر سے کوئی خارج امر ہے نہیں بلکہ یہ بھی مقدر ہی ہے مگر اس کو کسی امر کے دفع کرنے میں کچھ دخل نہیں کیونکہ اگر اس کو دفع میں کچھ دخل ہوتا تو لازم آتا کہ فرع (کوشش و محنت) اپنے اصل (مشیت ازلی) کو باطل کر دے اور یہ محال ہے۔

بعض محققین اہل باطن کا قول ہے کہ ہر ایک شخص اپنے خاتمہ سے ڈرا

کرتا ہے میں سابقہ ازلی سے ڈرتا رہتا ہوں کیونکہ خاتمہ کا اچھا یا برا ہونا سابقہ ازلی پر مبنی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے مقدرات ناممکن ہے کہ عاجز بندوں کے حیلہ سے ٹل جائیں ہم کسی باغ یا زراعت کو ہرا بھرا دیکھتے ہیں کہ ناگہاں کسی آفت کے نازل ہونے پر بے نام و نشان ہو جاتے ہیں قال اللہ تعالیٰ اَتَاھَا اَمْرُنَا لَیْلاً اَوْ نَھَاراً فَجَعَلْنٰھَا حَصِیْداً کَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ اسی طرح عبد کا حال ہے کہ وہ عمر بھر عبادت میں مجاہدات و ریاضت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے نیازی اس کو قعر جہنم میں لے جاتی ہے عاذنا اللہ تعالیٰ

ایک وہ لوگ جنہیں اپنے خاتمہ کی فکر ہے اور ایک وہ جنہیں سابقہ ازلی پر نظر ہے اور ایک وہ حضرات ہیں جنہیں غایت استغراق کی وجہ سے حال کی طرف بھی توجہ نہیں یہی لوگ ہیں جو سب سے بڑھ کر مقرب بارگاہ ہونے کا استحقاق رکھتے ہیں وَقَلِیْلٌ مَّا ھُمْ

خاصیت

نصف شب کے وقت باوضو حضور قلب سے ذرا دیر تک پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو کل امراض فرمائیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

العَدلُ

جل جلالہ

عدل مصدر ہے اور بطور مبالغہ فی الوصف اس سے عادل مراد لیا کرتے ہیں جیسے رب سے راب بر سے بار مراد ہے یعنی مصدر بمعنے صیغہ صفت (اسم فاعل) کے اکثر مستعمل ہے یقال عدلت الشئی اعدلہ اذا قومتہ یعنی عدل کے معنی راست کرنے کے ہیں جو کج کرنے کی ضد ہے اعتدال فی الامور اسی سے مشتق ہے جس کے معنی استقامت کے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے عدل ہونے سے یہ مراد ہے کہ ذات باری تمام نقائص سے جو افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں بالکلیت پاک ہے مثلاً وہ تنزیہ اور تشبیہ ہر دو سے بالاتر ہے یعنی نہ صرف تنزیہ جس سے صفات کی نفی لازم آئے اور نہ صرف تشبیہ جس سے اس کا جسم ہونا لازم آئے بلکہ وہ ذات مقدس تنزیہ اور تشبیہ ہر دو کے درمیان ہے اور یہی مسلک جمہور حضرات ائمہ اہل السنت والجماعت کا ہے چونکہ ذات باری ہر ایک قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس لئے وہ جور و ظلم سے منزہ ہے معتزلہ اور بعض دیگر اہل کفر و بدعت نے اس اسم پر اپنے ایک اعتراض کی بناء قائم کی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ جب خالق کفر ذات باری ہے اور کفر پر عذاب بھی وہی ذات

کرے گی اور یہ عذاب بھی بدی ہو گا تو یہ کہاں کا عدل ہے اس لئے ضروری ہوا کہ خالق کفر ذات باری کا وصف خلق اس کے علم اور ارادہ پر مبنی ہے اور وہ کبھی مخالف نہیں ہو سکتے لہٰذا وہی ذات خالق اشیاء ہے اس معارضہ کا جواب یقیناً معترضین کے پاس کچھ نہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وصف عدل کا ادراک ظلم و جور کی حقیقت کے ادراک پر مبنی ہے اور ظلم کے معنی ہیں وضع الشئی فی غیر موضعہ یعنی کسی چیز کو ایسے محل پر رکھنا جو در حقیقت اس کا محل نہیں اور اس امر کی حقیقت کا پتہ ذات باری کے افعال میں غور کرنے سے لگتا ہے اس لئے حقیقت عدل کا ادراک افعال ذات باری میں غور کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے اور افعال ذات باری کی حقیقت کا پتہ اس شخص کو لگ سکتا ہے جو ملکوت السموات والارض کی موجودات اور ان کے روابط کی حقیقت سے آگاہ ہو اور سلسلہ نظام کائنات کو اسباب و مسببات کی صورت میں مشاہدہ کر سکتا ہو۔

بعض اوقات عام لوگ یہ سمجھا کرتے ہیں کہ ایذاء ظلم ہے اور کسی کو نفع پہنچانا عدل مگر در حقیقت یہ صحیح نہیں کیونکہ ایک واعظ کو شمشیر اور ایک سپاہی کو علم حدیث کی کوئی کتاب بطور انعام دینا ایصال نفع تو ہے مگر اس کو عدل نہیں کہیں گے کیونکہ عدل وہی ہے جس کی تفسیر وضع الشئی فی موضعہ ہے۔ کیا کرتے ہیں اس خیال کی رو سے کسی کو عقوبت کرنا یا کسی مریض کو کڑوی دوائی پلانا یا اس کے زخم کا چیر پھاڑ کرنا عین عدل ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کو عین عدل سمجھتا ہے اور خواہ وہ اس کے مخالف ہوں یا موافق ان پر اعتراض نہ کرے اور اسی حظ کا نتیجہ ہے کہ وہ زمانہ یا فلک کو بھی برا بھلا نہیں کہتا جب کہ عام شعراء کا قاعدہ ہے کیونکہ اس سے حوادث کو غیر اللہ کی طرف نسبت کرنا پایا جاتا ہے بلکہ اسے یقین کلی ہوتا ہے کہ تمام حوادث ارادہ ذات باری پر مبنی ہیں اور تمام اسباب زمانہ نجوم وغیرہ اس کے ارادہ ازلی کے تابع ہیں

toobaa-elibrary.blogspot.com

الغرض انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ افراط و تفریط سے محفوظ ہو کر غضب و شہوت کو قوت عاقلہ کے تابع رکھتا ہے اور جب وہ اپنی ذات میں وصف عدل سے موصوف ہو جاتا ہے تو اصلاح نفس کے بعد دیگر بنی نوع کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد ہوا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته یعنی ہر ایک شخص اپنی اپنی رعایا کی بابت قیامت کو پوچھا جائے گا انسان کے اعضاء اور قوی بھی اس کی رعایا ہیں۔

خاصیت

شب جمعہ میں روٹی کے بیس ٹکڑوں پر اس کو لکھ کر کھانے سے قلوب مخلوق کے مسخر ہو جاویں۔

اللَّطِيفُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰهُ لَطِيْفٌ بِعِبَادِهٖ اور پھر فرمایا اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ اس اسم کی حقیقت کا ادراک بھی ذات باری کے افعال کی حقیقت پر مطلع ہونے کی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی تفسیر میں چار قول مذکور ہیں۔

(ا) اس چھوٹی سی چیز کو بھی لطیف کہہ دیا کرتے ہیں جو بدرجہ غایت صغیر ہونے کی وجہ سے محسوس نہ ہو سکتی ہو چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات جسم اور جہت سے بالاتر ہے اور اس کا احساس ناممکن ہے اس لئے یہاں لفظ ملزوم سے اس کا لازم معنی یعنی ذات غیر محسوس مراد ہے۔

(ب) لطیف اس شخص کو بولتے ہیں جو باریک سے باریک امور کا علم رکھتا ہو چنانچہ لطیف الید ایسے شخص کو بولتے ہیں جو اپنی صنعت میں اعلیٰ مہارت اور نزاکت کا استعمال کر جانتا ہو جس کو کوئی دوسرا نہ جانا سکے اس تفسیر کی رو سے لطیف سے وصف علم کا اشارہ مفہوم ہوتا ہے چونکہ ذات باری کے افعال میں اعلیٰ سے اعلیٰ لطافت پائی جاتی ہے اس لئے وہ لطیف ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

(ج) لطیف وہ ذات ہے جو اپنے بندوں پر اس طرح مہربان ہو کہ ان کو اس کے طریق لطف کا نہ تو علم ہو اور نہ ان وجوہ صالح سے جو ان کی بہبودی کے لئے تیار کرتا ہے کوئی آگاہ ہو قال اللہ تعالیٰ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَاءُ

(د) امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم لطیف کا استحقاق اس ذات کو حاصل ہے جو دقیق سے دقیق مصالح کا علم رکھنے کے ساتھ ان مصالح کو ان کے مناسب مواضع تک نہایت نرمی کے ساتھ پہنچادے اور جب یہ علم اور عمل ہر دو کسی ذات کو حاصل ہوں تو وہ بدرجہ کمال لطیف ہے سو یہ کمال بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں کمال علم تو ظاہر ہے کیونکہ کوئی امر ظاہر ہو یا باطن ذات باری پر مخفی نہیں بلکہ ہر دو اس کے نزدیک یکساں ہیں اور افعال میں اس کے رفیق یعنی نرمی کا یہ حال ہے کہ عقل انسانی اس کے حصر سے عاجز ہے دیکھو انسان کے ہیکل عنصری میں کس قدر قوتیں عمل کر رہی ہیں مگر انسان کو ان کے عمل کا کچھ علم نہیں ہوتا عالم کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر ہم اس میں سے صرف ایک لقمہ کی تشریح کرنے لگیں جس کو انسان اپنے منہ میں رکھتا ہے تو اس کی ابتداء سے انتہا تک کے اسباب کو بیان کرنے کے لئے تمام کائنات کے آسمانی اور زمینی ورق الٹنے پڑیں گے اور پھر بھی ہم ہزاروں اور لاکھوں مخفی اسباب سے بے خبر رہیں گے اور ان اسباب ضروریہ کے عمل کی رو سے ذات باری کو مختلف اسماء سے تعبیر کریں گے چنانچہ وہ حکیم ہے جواد ہے مصور ہے عدل ہے لطیف ہے اور اس تشریح کی حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو افعال ذات باری کی حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے۔

واضح ہو کہ ذات باری کے لطف کا نتیجہ ہے کہ اس نے ہمیں حصول سعادت کے اسباب پر آگاہ کر کے ان کے استعمال کی توفیق دی جبکہ ایک مختصر مدت العمر میں اس نے اپنے دنیوی یا اخروی انعامات سے بہرہ یاب ہونے کا موقع دے رکھا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ لطیف وہ ذات ہے جو ہر ایک مشکل کو

آسان بنادے اور ہر ایک شکستہ کا جبر کرے اور بعض فرماتے ہیں کہ لطیف وہ ذات ہے جو ابتداء میں توفیق عمل صالح عطا فرمادے اور انتہاء میں اس کو پایہ قبول پہنچے اور بعض نے یوں تعبیر کی ہے کہ لطیف وہ ذات ہے کہ باوجود ولی ہونے کے ستر محبوب کرے اور اپنی عطاء سے غنی بنادے۔

انسان کامل کو اس سے یہ بہرہ ملتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں پر شفقت ورافت کا اظہار فرمادے جس کی اعلیٰ صورت یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو دعوت الی الحق کرے بعض محققین نے لکھا ہے کہ عارف کا نشان یہ ہے کہ وہ جب کسی شخص کو امر بالمعروف کرتا ہے تو طریق انبیاء علیہم السلام کے مطابق نرمی کا استعمال کرتا ہے اور درشتی سے ہرگز کام نہیں لیتا وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ سر قضاء وقدر کو چشم بصیرت سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

خاصیت

۱۳۳ بار پڑھنے سے رزق میں وسعت ہو تمام کام لطف سے پورے ہوں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

الْخَبِيْرُ

حل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ اور پھر فرمایا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یہ اسم مصدر خبرت سے مشتق ہے جس کے معنی آگہی کے ہیں اور علماء نے اس کی تفسیر دو طرح پر کی ہے اول یہ کہ خبیر وہ ذات ہے جو اشیاء کی کنہ اور حقیقت پر مطلع ہو یقال فلان خبیر بهذا الامر وله به خبرة وهو اخبر به من فلان ای اعلم مگر جب انسان کے لئے اس اسم کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ایسے علم سے ہوا کرتی ہے جو بذریعہ امتحان حاصل ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کا علم امتحان یا یوں کہو کہ تجربہ و مشاہدہ پر مبنی نہیں بلکہ اس کا علم ذاتی ہے دوم عبدالملک طبری لکھتے ہیں کہ فعیل بمعنی مفعل مستعمل ہے چنانچہ یہاں بھی خبیر بمعنی مخبر یعنی خبر دہندہ ہے جیسے مدیع بمعنی مبدع اس صورت میں خبیر سے کلام ذات باری مراد ہوگا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خبیر وہ ذات ہے جو تمام اخبار باطنہ سے آگاہ ہو اور مَلَكُوْتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں کوئی ایک ذرہ بدوں اس کے علم کے سکون و حرکت نہ کر سکے اس لئے اسم علیم کا مترادف ہے فرق

صرف یہ ہے کہ علم ذات باری کو جب خفایائے باطنہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے تو اس کو خبرۃ بولتے ہیں گویا اسم خبیر خاص ہے اور اسم علیم عام۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عالم صغیر یعنی قلب کے تمام اندرونی حالات سے بدرجہ کمال آگاہ ہوتا ہے اور محاسن اخلاق اور مقابح صفات سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور اس بارے میں شیطان اور نفس کے نہایت باریک تسویلات باطلہ پر مطلع ہو کر ان سے محترز رہتا ہے۔

حضرات مشائخ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس اسم کی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے وہ تقویٰ کی صراط مستقیم سے کبھی منحرف نہیں ہوتا اور خواہشات نفس سے برطرف رہتا ہے چنانچہ امام علی زین العابدین بن حسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ جو شخص نصرت عشیرہ (قبیلہ) عزت اور بلا سلطنت ہیبت اور بلا فقر توانگری کی خواہش رکھتا ہے اسے چاہیے کہ ذلت معصیت سے نجات پا کر عزت طاعت کی بلندی پر ترقی کرے۔

خاصیت

سات روز تک بکثرت پڑھنے سے اخبار غیبیہ معلوم ہونے لگیں اور جو کسی موذی کے پنجہ میں گرفتار ہو اس کو بکثرت پڑھنے سے حالت درست ہو جاوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْحَلِیْمُ

جل جلالہ

یہ اسم مصدر حلم سے مشتق ہے جس کے معنی سکون نفس کے ہیں علماء لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو باوجود گناہ اور جرم کے دیکھنے اور قدرت انتقام رکھنے کے مواخذہ کرنے میں جلدی نہ کرے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص انتقام میں جلدی نہ کرے مگر اس کی نیت انتقام کی ہو تو وہ حلیم نہیں کہلا سکتا بلکہ اسے حقود یعنی کینہ توز کہتے ہیں اور اگر وہ یہ عزم رکھتا ہو کہ کبھی انتقام نہیں لے گا تو اس امر کو عفو و مغفرت بولتے ہیں اور یہ حلم نہیں اس لئے سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ آیا حلم میں انتقام کا خیال بھی مضمر ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کیونکہ اگر حلیم منتقم بھی ہوتا تو ذات باری کے ذوالانتقام ہونے کے کوئی معنی نہ تھے وجہ اس کی یہ ہے کہ ذوالانتقام میں جلدی یا دیر سے انتقام کا مفہوم شامل نہیں اس لئے صحیح یہ ہے کہ حلیم ذوالانتقام کا ضد ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذات باری کا علم انسانی دائرہ قیاس سے بالاتر ہے اور یہی وجہ ہے کہ کتاب مجید میں ارشاد فرمایا۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ یعنی اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو

ان کی بد اعمالیوں پر پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کوئی متنفس زندہ نہ چھوڑتا۔

روایت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے ایک شخص کو فسق و فجور میں مستغرق دیکھ کر اس کی ہلاکت کی دعاء کی وہ شخص ہلاک ہو گیا پھر ایک دوسرے شخص کو اسی حالت میں دیکھا اور دعاء کی چنانچہ وہ بھی ہلاک ہوا علی ہذا ایک تیسرے کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی جب چوتھی دفعہ آپ ایک فاسق کی نسبت دعائے ہلاکت کرنے لگے تو بذریعہ وحی آپ کو بارگاہ رب العزت سے یوں ممانعت ہوئی کہ اے ابراہیم بس ٹھہر جاؤ اگر ہم ہر ایک شخص کو اسی طرح گناہوں پر مواخذہ کرنے لگیں تو روئے زمین پر سوا گنتی کے چند آدمیوں کے کوئی زندہ نہیں رہے گا مگر ہمارا قانون ہے کہ جب کوئی معصیت کرتا ہے تو ہم اسے مہلت دیتے ہیں اگر وہ توبہ کرلے تو ہم اس کی توبہ کو قبول فرما لیتے ہیں اور اگر معصیت پر اصرار کرتا چلا جائے تو عذاب میں تاخیر کر دیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ بیچارہ ہمارے قبضہ قدرت سے کبھی باہر نہیں جا سکتا۔

روایت۔ ایک نوجوان سخت فاسق و فاجر تھا مگر اس میں خوبی یہ تھی کہ وہ جونہی گناہ کرتا فی الفور توبہ کر لیا کرتا یعنی گناہ پر اصرار نہ کیا کرتا تھا ایک دفعہ ابلیس نے اس کو ایک خاص حالت میں مخاطب کر کے کہا کہ تم کب تک ایسا کرتے رہو گے۔ ابلیس کی اس سے یہ غرض تھی کہ اس کو رحمت خداوندی ہی سے ناامید کر دے جب رات ہوئی تو وہ نوجوان اٹھا اور وضو کیا اور دو رکعت نماز ادا کر کے ہر دو ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور یوں مناجات کرنے لگا۔

اے میرے پاک اور سچے خدا جو معصوموں کو عصمت عطا کرتا ہے اور صالحین کی اصلاح فرماتا ہے اگر تو مجھے بچائے گا تو میں بچ جاؤں گا اور اگر تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں ذلیل ہو جاؤں گا میں تیری مشیت ازلی کے آگے مقہور ہوں میرا خیر و شر سب کچھ تیرے ہاتھ میں ہے اے دلوں کے پھیر دینے والے خدا! میرے قلب کو اپنے پاک دین کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ جب وہ شخص

toobaa-elibrary.blogspot.com

مناجات کر چکا تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے گروہ ملائکہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے میرے ملائکہ! کیا تم نے میرے بندے کے کلام کو سنا ہے؟ تم شاہد رہو کہ ہم نے اس کے گذشتہ نامہ اعمال کو جو کثرت گناہ سے سیاہ ہو گیا تھا آب رحمت سے دھو ڈالا ہے اور آئندہ کے لئے اس کو توفیق عصمت عطا فرمادی ہے۔

روایت۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میرے پڑوس میں ایک شخص نہایت فاسق و فاجر رہا کرتا تھا لوگ اس کی بے اعتدالیوں سے سخت تنگ آگئے تھے انہوں نے مجبور ہو کر ایک دن میرے پاس شکایت کی میں نے اسے بلا بھیجا اور کہا کہ یا تو تم اپنی بد کرداریوں سے باز آجاؤ یا اس محلہ کو چھوڑ دو اس نے جواب دیا کہ میں نہ تو اپنی عادت سے باز آؤں گا اور نہ ہی محلہ کو چھوڑوں گا ہم نے کہا کہ ہم بادشاہ کے پاس تمہاری شکایت کریں گے اس نے کہا کہ بادشاہ مجھے خوب جانتا ہے ہم نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لئے دعائے بد کریں گے اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی نسبت مجھ پر زیادہ مہربان ہے مجھے اس شخص کا یہ کلام سن کر سخت غصہ آیا جب رات ہوئی تو میں اٹھا اور وضو کیا اور اس کے حق میں دعائے بد کی اتنے میں ایک ہاتف غیب نے آواز دی کہ دعائے بد مت کرو کیونکہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی جماعت اولیاء میں داخل ہے مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنے کئے پر سخت پچھتایا اور گھر سے نکل کر اس شخص کے گھر پہنچا اس نے مجھے دیکھ کر یہ سمجھا کہ میں اسے محلہ سے نکالنے کے لئے آیا ہوں وہ مجھ سے عذر خواہی کرنے لگا میں نے کہا کہ میں اس لئے تمہارے پاس نہیں آیا بلکہ رات کو تمہاری نسبت مجھے ایک واقعہ پیش آیا ہے چنانچہ میں نے وہ واقعہ کہہ سنایا اور سنتے ہی زار و زار رونے لگا اور توبہ کی اور گھر سے نکل پڑا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کر لی پھر اس کے بعد ایک دفعہ جب مجھے حج جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ایک مجلس میں اس شخص کو صاف پڑا پایا اور میرے پہنچنے پر چند سانس لئے اور ملک عدم کو سدھارا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

واضح ہو کہ حلم مخملہ محاسن اخلاق کے ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس فرزند ارجمند کے پیدا ہونے کی خوش خبری سنائی ہے اس کو وصف حلیم سے موصوف ظاہر فرمایا ہے حیث قال فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو بندوں سے درگذر کر جائے اور عیوب پر پردہ پوشی کرے بعض لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے کہ پردہ پوشی کرنے کے بعد مغفرت عطا فرمادے اور بعض نے یوں تفسیر کی ہے کہ حلیم وہ ذات ہے جو حفظ مودت اور حسن عہد اور ایفائے وعدہ سے متصف ہو بعض لکھتے ہیں کہ حلیم وہ ذات ہے جو مستغفرین فی الذنوب کو معاف کر دے اور بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ حلیم وہ ذات ہے جس کو کسی عاصی کی معصیت غضب میں نہ لائے۔

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے وہ سب پر ظاہر ہے اور حق یہ ہے کہ حلم انسان کے لئے زینت باطنی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ حلیم اپنے حلم سے درجہ نبوت کے قریب پہنچ جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ غضب کو روکنا ایک بھاری جہاد نفس ہے جس کے ضمن میں کئی ایک اخلاقی خوبیاں مندرج ہیں۔

خاصیت

اگر رئیس قومی اس کو بکثرت پڑھے اس کی سرداری خوب چلے اور راحت سے رہے اور اگر کاغذ پر لکھ کر پانی سے دھو کر اپنے پیشہ کے آلات و اوزار پر ملے تو اس پیشہ میں برکت ہو اگر کشتی ہو غرق سے محفوظ رہے اگر جانور ہو ہر آفت سے مامون رہے۔

دعاء

لا اله الا الله الحليم الكريم سبحان الله رب العرش العظيم والحمد لله رب العلمين. (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْعَظِیْمُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَھُوَالْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ مصدر عظمت سے مشتق ہے واضح ہو کہ وصف عظیم ازروئے لغت ایسے جسم پر اطلاق کیا جاتا ہے جو کسی دوسرے جسم کی نسبت مساحت میں زیادہ ہو اس لئے جب دو چیزیں ایسی ہوں کہ ایک دوسری کی نسبت طول و عرض و عمق میں بڑی ہو تو اس کو عظیم بولیں گے اور جب کئی چیزیں ایسی ہوں کہ ان میں ایک دوسری کی نسبت اور دوسری تیسری کی نسبت اور تیسری چوتھی کی نسبت علیٰ ہذا القیاس بڑی ہو تو جو چیز سب سے بڑی ہو گی وہ اعظم کہلائے گی اس سے ہر ایک چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت عظیم ہوتی ہے اور ایسی چیز کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اول یہ کہ دیکھ کر آنکھیں اس کی ہیبت سے پر ہو جائیں دوم جس کے اطراف کو آنکھ احاطہ نہیں کر سکتی جیسے زمین و آسمان کیونکہ ہاتھی اور پہاڑ بھی عظیم الجثہ ہیں۔ مگر ان کے اطراف کو آنکھ احاطہ کر سکتی ہے اس لئے زمین و آسمان بہ نسبت دیگر اشیاء کائنات کی عظیم ہیں یہی وجہ ہے کہ جسمانیات میں انہیں عظیم مطلق کہا جاتا ہے۔

جس طرح جسمانی چیزوں میں ایک چیز دوسری چیز کی نسبت عظیم ہوتی

ہے اسی طرح عقلی چیزوں میں بھی حقائق متفاوت ہیں جن میں سے بعض کا تو عقل انسانی احاطہ کر سکتی ہے اور بعض دائرہ عقل سے خارج ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حقائق عقلیہ مثلاً علم قدرت سلطنت وغیرہ کے رو سے بعض چیزیں ایسی ہو سکتی ہیں جو بہ نسبت دوسری چیزوں کی بدرجہ غایت عظیم ہو سکتی ہیں چنانچہ قرآن مجید کو عظیم کہا گیا ہے اور حدیث میں ہرقل قیصر روم کو عظیم الروم کے خطاب سے تعبیر کیا گیا ہے چونکہ ذات باری اپنی صفات علم قدرت عزت و سلطان وغیرہا میں تمام موجودات سے بدرجہ لامتناہی برتر ہے اس لئے وہی حقیقی طور پر عظیم کہلانے کی مستحق ہے اس لئے وہ ہر ایک عظیم سے اعظم ہے کیونکہ اس کی کنہ صمدیت کو عقول بشری ہرگز احاطہ نہیں کر سکتیں بلکہ تمام موجودات اس کی عظمت و جبروت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتی کیونکہ ماسوی اللہ جو کچھ وجود پذیر ہو چکا ہے اور آئندہ ہو گا متناہی ہے اور وہ ذات باکمال لامتناہی اور متناہی کو لامتناہی سے کچھ نسبت نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ ماسوئے اللہ ذات باری کے مقابلہ میں ہیچ محض ہے قال اللہ تعالیٰ کل شیء ھالك الا وجھہ بلکہ اگر عرش بریں سے فرش زمین تک تمام افراد موجودات کا ہزار گنا موجودات وجود پذیر ہو جاوے تو پھر بھی اس کو بمقابلہ ذات باری عزاسمہ کوئی نسبت نہیں ہو سکتی کیونکہ بہر صورت وہ موجودات متناہی ہی ہو گی یہی وجہ ہے کہ کتاب مجید میں ارشاد فرمایا انما امرہ اذا اراد شیئاً ان یقول لہ کن فیکون اس کی لامتناہی قدرت کے سامنے تمام سلسلہ کائنات کا درہم برہم کر دینا اور ایک ناتواں چیونٹی کے مسکن کا تباہ کرنا ایک ہی بات ہے فسبحانہ من ملك تحیرت العقول فی انوار صمدیتہ وبطلت الافہام فی اشراق عزتہ

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کے موازنہ کرنے کے لئے اس اصل میں غور کرنا چاہیے کہ جب دو چیزوں میں سے ایک بدرجہ غایت کامل ہوتی ہے اور دوسری بدرجہ ناقص تو ہر دو کے اتصال کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ناقص کامل میں مل کر بے نام و نشان ہو جایا کرتی ہے جیسے ایک بارش کا قطرہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

جب بحر بے پایاں سے اتصال پاتا ہے تو بے نام و نشان ہو جاتا ہے یا اگر کا شعلہ اگر کسی ایسے غار میں جو آگ سے پر ہو ڈال دیا جائے تو اس آگ میں پڑ کر محو ہو جاتا ہے یا ایک مچھر کے اڑنے کی آواز جو طبل و بوق کی آواز کے سامنے بالکل غیر محسوس ہو جاتی ہے یا ایک چراغ کی روشنی جو نصف النہار میں ایک وسیع میدان میں جلا کر رکھ دیا جائے۔ الغرض محسوسات میں اس اصل کے کئی ایک نظائر موجود ہیں اسی طرح عقلیات میں بھی یہ اصل جانئے خود صحیح اور درست ہے ایک ادنیٰ شاگرد کا علم اپنے استاد کامل کے علم کے سامنے بالکل بے نمود ہوتا ہے اس لئے استاد اپنے شاگرد کی نسبت عظیم کہلانے کا مستحق ہے اسی طرح ایک شیخ اپنے مرید کی نسبت عظیم ہے اور جناب سرور کائنات تمام افراد امت سے عظیم ہیں اس اصل کے سمجھ لینے پر یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ کسی شخص کا عظیم ہونا یا تو دنیوی پہلو میں ہوگا اور وہ ظاہر ہے کیونکہ جس قدر اعتبارات دنیوی از قسم مال و منصب کسی کو حاصل ہوں گے اسی قدر وہ شخص عظیم سمجھا جائے گا یا دینی پہلو میں جس کی نسبت ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ من تعلم وعلم وعمل بما علم ثم علم الغیر فذلك یدعی عظیما فی السماء یعنی جو شخص علم حاصل کر کے عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے گروہ ملائکہ میں اسے عظیم بولا جاتا ہے عارف کامل میں جب آثار بشریت مضمحل ہو جاتے ہیں اور انوار توحید مملکت قلب میں ظاہر ہونے لگتے ہیں تو وہ خود بے نام و نشان ہو کر بقاء ذات واحد حقیقی کے ساتھ زندہ ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے نام و نشان ہو کر خود واحد حقیقی بن جاتا ہے عبد ہر ایک مقام میں عبد ہی رہتا ہے ہاں اس کو ایک عقلی اور معنوی تقرب ذات حقیقی سے اس حد تک حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ظاہر و باطن میں مظہر صفات کاملہ ہو کر ان معارف و حقائق کا مالک ہو جاتا ہے جو عقول بشری کے انداز سے بالاتر ہیں اور اسی مقام پر خرق عادات ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ عظیم وہ ذات ہے کہ جس کی عظمت اغیار

کی تعظیم پر موقوف نہ ہو اور جس کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانا ممکن ہو اور بعض لکھتے ہیں کہ عظیم وہ ذات ہے جس کی عظمت کا کوئی آغاز نہ ہو اور نہ اس کے جلال کا کوئی انجام۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے عزت اور ہر مرض سے شفا ہو۔

دعاء

سبحان الله العظیم و اذا اجتهد فی الدعاء قال یا حیی یا قیوم (ترمذی)

اللهم سجدلك سوادی وخیالی وبك امن فوء ادی ابوء بنعمتك علی وهذا ماجنیت علی نفسی یا عظیم یا عظیم اغفرلی ذنبه لایغفر الذنوب العظیمة الا الرب العظیم (حصن حصین)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْغَفُوْرُ

جل جلالہ

غفران مصدر سے مشتق ہے اور مبالغہ کا وزن ہے اور غفار اور غفور میں فرق یہ ہے کہ غفار کا مبالغہ کمیت فعل کے متعلق ہے یعنی باوجود بار بار گناہ کرنے کے مغفرت کرنے والا غفار ہے اور غفور کا مبالغہ کیفیت فعل کے متعلق ہے یعنی ایسی مغفرت جو اپنی خوبی و عمدگی میں غایت کمال تک پہنچ گئی ہو مزید تشریح کے لئے اسم غفار کی تفسیر کو ملاحظہ کرنا چاہیے۔

خاصیت

الغفور تار والے کو تین بار لکھ کر باندھ دیا جاوے تار جاتا رہے۔

دعاء

الحمد لله الذی ردالی نفسی ولم یمتهافی منامها الحمد لله الذی یمسك السموت والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکهما من احد من بعده انه کان حلیماً غفورا الحمد لله الذی یمسك السمآء ان تقع علی الارض الا باذنه ان الله بالناس لروف رحیم. (حصن حصین)

اَلشَّکُوْرُ

جل جلالہ

اس اسم کی تشریح میں چند ایک مسائل قابل تحقیق ہیں اول یہ کہ اسم شکور اسم فاعل (شاکر) کا صیغہ مبالغہ ہے جو مصدر شکر سے مشتق ہے اور اصل لغت میں اس کے معنی زیادتی کے ہیں چنانچہ شکیر الشجر درخت کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کو بولتے ہیں جو اس کی جڑ میں نکل پڑتی ہے اور ناقۃ شکیرۃ ایسی اونٹنی کو بولتے ہیں جس کا خوشہ دودھ سے پر ہو اور شکرت الارض اس وقت بولتے ہیں جب کسی زمین میں بہت سی نبات ہو قرآن مجید میں لفظ شاکر اور شکور ہر دو ذات باری کے لئے وارد ہوئے ہیں اور امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کی توجیہ یوں کی ہے کہ شکور وہ ذات ہے جو طاعت قلیل کے عوض میں اجر کثیر اور چند روز زندگی کے اعمال کے مقابلہ میں نعیم ابدی عطا فرماوے اور جو شخص اپنے محسن کے احسان پر اس کی ثنا کہتا ہے تو وہ بھی اس کا شکر گذار کہلاتا ہے چنانچہ فرمایا من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ یعنی جو شخص کسی محسن آدمی کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا یہ امر بھی قابل غور ہے کہ قرآن مجید کے اکثر مواقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک

toobaa-elibrary.blogspot.com

بندوں کے اعمال حسنہ پر ثنا کی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ محض اس کی رحمت ہے اور در حقیقت وہ ثنا اس ذات مقدس کی ثناء سمجھنی چاہئے کیونکہ بندہ سے جو اعمال حسنہ صادر ہوتے ہیں وہ صرف اس کی توفیق کا نتیجہ ہیں اس لئے فی الحقیقت وہی ذات مقدس شکر کی مستحق ہے اور حق یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عہدہ شکر سے کبھی بری نہیں ہو سکتا کیونکہ توفیق شکر جائے خود ایک نعمت ہے جس پر ادائے شکر واجب ہے اس لئے کسی ایک ہی نعمت کا سلسلہ شکر اس قدر طویل ہو جاتا ہے کہ انسان کی ساری عمر بھی ادائے شکر کے لئے منتہی نہیں ہو سکتی چنانچہ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا میں اسی اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا حصر نہیں ہو سکتا تو ان نعمتوں پر ادائے شکر کیسے متصور ہو گا اس لئے بہترین صورت ادائے شکر کی یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک حقیقی کی دی ہوئی نعمتوں کو خواہ بدنی ہوں یا مالی ظاہری ہوں یا باطنی معصیت میں صرف نہ کرے اور یہی شکر کے حقیقی معنی ہیں مگر یہ بات بھی توفیق خداوندی پر موقوف ہے۔

حقیقت شکر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے حقیقت کو سمجھ لیا جائے سو واضح ہو کہ نعمت ہر ایک ایسے امر کو بولتے ہیں جس سے انسان منتفع ہو سکتا ہو اب غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ نعمت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی چیز بھی عالم کائنات میں ایسی نہیں جس سے انسان منتفع نہ ہوتا ہو اس لئے بندہ کا شکر گذار ہونا یہ ہے کہ وہ اپنے افعال و اقوال میں ایسے احکام کا پابند ہو جو رضائے الٰہی پر مبنی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہونا یوں ہو گا کہ وہ اس افعال و اقوال پر بندہ کو جزائے خیر عطا فرماتا ہے اور چونکہ ہر ایک نعمت کا منعم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے حیث قال وَمَا بِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ اس لئے فی الحقیقت کوئی شخص مستحق شکر نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی عبد کا کسی غیر سے احسان کرنا انعام خداوندی پر موقوف ہے اگر وہ توفیق احسان نہ دیتا تو وہ کبھی احسان نہ کر سکتا اس لئے عبد ہر ایک حالت میں معزول ہے۔ اور اسے خیر و شر میں کچھ

دخل نہیں معہذا وہ اشیاء جن سے عبد احسان کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہوتی ہیں اور اسی کی مملوک بھی ہیں اس لئے انسان خود کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کا حقیقی احسان کرنا بھی ناممکن ہے عبد جب کسی سے احسان کرتا ہے تو اس پر معاوضہ کی امید رکھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے احسان کی یہ صورت نہیں کیونکہ وہ باوجود بندہ سے مستغنی ہونے کے اس پر احسان کرتا ہے اس لئے بندہ اگر اللہ تعالیٰ کا جو منعم حقیقی ہے ادائے شکر کرے تو یہ شکر اس کی نعمت کا معاوضہ نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ ابو بکر واسطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شکر ایک قسم کا شرک ہے یعنی اگر بندہ یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے مقابلہ پر ادائے شکر کرنے سے احسان کا مقابلہ احسان سے ہو جاتا ہے تو یہ خیال مشرکانہ ہے کیونکہ ذات باری تو اپنے عبد سے مستغنی ہے مگر عبد اپنے رب سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتا اس لئے استغناء اور احتیاج کا کوئی مقابلہ نہیں عارف کا مقام شکر عوام الناس کے مقام شکر سے کہیں بالاتر ہے کیونکہ عوام الناس تو بذریعہ افعال اور اقوال کے ادائے شکر کیا کرتے ہیں اور ان کی نظر نعمت پر ہوتی ہے مگر عارف کامل نعمت سے ہٹ کر منعم کی طرف رجوع کیا کرتا ہے یعنی نعمت کو نظر انداز کر کے منعم کو اپنا مقصد حقیقی قرار دیتا ہے۔

یہ امر نہایت قابل غور ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے تئیں وصف شکر سے موصوف کیا ہے حالانکہ یہ مقام عارف کامل کا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے محض اپنی رحمت کاملہ سے باوجود استغناء ذاتی کے اپنے بندوں کے اعمال کو پایہ قبول عطا ہے حالانکہ انسان کا وجود اور تمام اسباب جو ادائے شکر میں واسطہ بنتے ہیں اسی کے عطا کئے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام اہل تحقیق بالاتفاق مانتے ہیں کہ انسان ضعیف البنیان ہرگز ادائے شکر کے فرائض سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا ولنعم ما قیل۔

از دست و زبان کہ بر آید کز عہدہ شکرش بدر آید

کسی اور اہل دل نے کہا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگر ہر موئے من گردد زبانے　　ز تو رانم بہر یک داستانے
نیارم گوہر شکر تو سفتن　　سر موئے ز احسان تو گفتن

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شکور وہ ذات ہے جو عطائے جزیل کرے اور قلیل سے قلیل اطاعت کو پایہ قبول بخشے

خاصیت

جس کو ضیق النفس یا تکان یا گرانی اعضا ہو اس کو لکھ کر بدن پر پھیر دے اور پیوے تو نفع ہو اور اگر ضعیف ابصر اپنی آنکھ پر پھیرے نگاہ میں ترقی ہو۔

اَلْعَلِیُّ

جل جلالہ

قال اللہ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ یہ اسم مصدر علو سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں امام غزالی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں کہ علی وہ ذات ہے جس کے رتبہ کے مقابلہ میں تمام مراتب پست ہیں سو جس طرح اشیاء محسوسہ میں بعض اجسام دیگر بعض کی نسبت بالاتر ہوتے ہیں اسی طرح اشیاء معقولہ (عقلیات) میں بھی مراتب ہیں یعنی بعض دیگر بعض کی نسبت اشرف اور اعلیٰ ہوتے ہیں مثلاً علت اپنے معلول سے اور کامل بہ نسبت ناقص کے اشرف و اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور یہ علو کسی بلند یا پست مکان کے لحاظ سے ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ اعتبار عقلی کے رو سے یہ نسبت ملحوظ ہوتی ہے اس اعتبار عقلی کی رو سے اگر ہم موجودات عالم کے مراتب کمال و نقصان کا موازنہ کرنے لگیں تو یقیناً ذات باری کو سب سے اعلیٰ رتبہ میں پائیں گے کیونکہ وہ اپنے صفات کاملہ میں کسی غیر کا محتاج نہیں برخلاف دیگر افراد موجودات کے جو باہم مدارج کمال میں متفاوت ہیں مگر سب کے سب ربوبیت ذات باری کے محتاج ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دوسری قسم کی موجودات حس و حرکت اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

قوت ارادہ اور ادراک سے بے بہرہ ہیں اس لئے وہ اسفل السافلین میں شمار کئے جاتے ہیں اور حیوانات مطلق گو حس و حرکت اور ارادہ رکھتے ہیں مگر ادراک معقولات سے عاری ہیں اس لئے پہلی قسم کی موجودات دوسری قسم سے اعلیٰ ہے مگر پہلی قسم میں پھر تقسیم عقلی جاری ہو سکتی ہے کیونکہ ذوی العقول یا تو شہوت و غضب رکھتے ہیں یا ان ہر دو سے عاری ہیں پہلی قسم حضرت انسان ہے جو ادراک معقولات کے ساتھ حیوانی لوازم مثلاً شہوت و غضب سے بھی متصف ہیں اور دوسری قسم میں پھر تقسیم جاری ہو گی کیونکہ ایسے ذوی العقول جو شہوت و غضب سے عاری ہیں اگر ان کا غضب و شہوت سے متصف ہونا ممکن ہو تو وہ ملائکہ ہیں اور اگر ناممکن ہو تو وہ ذات باری ہے اس لئے اس تقسیم در تقسیم سے یہ نتیجہ نکلا کہ تمام موجودات میں بلحاظ کمال کے جمادات اسفل السافلین میں ہیں اور ان سے اعلیٰ حیوانات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ حضرت انسان اور حضرت انسان سے اعلیٰ ملائکہ کرام اور ملائکہ کرام سے اعلیٰ ذات باری عزاسمہ جو کامل مطلق اور اس لئے سب سے اعلیٰ ہے اس تقسیم میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ اجسام میں عرش عظیم سب سے اعلیٰ ہے کیونکہ وہ تمام اجسام کا محدد ہے اور وہ خود کسی چیز سے محیط نہیں یہی وجہ ہے کہ ذات باری تمام موجودات سے بالاتر ہے مگر قرآن مجید میں عرش سے بالاتر ہونا ظاہر فرمایا کیونکہ عرش تمام موجودات عالم سے بالاتر ہے اور یہ فوقیت ذات باری کی مکانی نہیں بلکہ عقلی ہے کیونکہ جس طرح دو شخص صدر مجلس میں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ ہر دو میں سے ایک دوسرے سے اعلیٰ ہے حالانکہ اعلیٰ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسرے کے سر پر بیٹھا ہے بلکہ یہی کہنا پڑے گا کہ ایک کا درجہ دوسرے سے اعلیٰ ہے یہی عقلی علو ذات باری کی نسبت سمجھنا چاہئے کیونکہ وہ بلحاظ کمالات کے تمام موجودات سے بالاتر ہے یہیں سے یہ نکتہ بھی کھل جائے گا کہ عبد کبھی علی مطلق نہیں ہو سکتا کیونکہ گو وہ دیگر موجودات سے کمالات میں بڑھ جائے جیسے ذات بابرکات جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ

وسلم مگر یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی مخلوق ذات باری کا رتبہ پا کر علی مطلق بن جائے آیۃ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ اور آیہ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ میں اسی فوقیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ علو ذات باری کی تین توجیہات ہو سکتی ہیں اول یہ کہ کوئی موجود شرف و عزت میں اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا دوم یہ کہ وہ تمام موجودات پر قدرت تامہ رکھتا ہے اور سب کے سب اس کے مقہور و مغلوب ہیں سوم یہ کہ وہ تمام امور میں حسب مشیت ازلی متصرف ہے اور کوئی امر اس کی مشیت کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ علم و قدرت و طہارت میں سب سے فائق ہو جاتا ہے یا یوں کہو کہ اس کو تمام ماسوائے اللہ کے استغناء کلی حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے مگر عوام الناس ایسے انسان کی شناخت سے عاجز ہوتے ہیں۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ علی وہ ذات ہے جو ادراک سے بالاتر ہو اور جس کے صفات احاطہ تصور سے خارج ہوں۔

خاصیت

اگر لکھ کر بچے کے باندھ دیا جاوے جلدی جوان ہو اگر مسافر اپنے پاس رکھے تو جلدی اپنے عزیزوں سے آملے گر محتاج ہو تو غنی ہو جاوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْکَبِیْرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ اور پھر فرمایا وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس مادہ سے ذات باری کے متعلق شریعت میں تین اسم وارد ہوئے ہیں کبیر متکبر اکبر آخر کا اسم قرآن میں صفات (قال اللہ تعالیٰ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ اور پھر فرمایا وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ) کے متعلق وارد ہوا ہے نہ ذات باری کی نسبت البتہ احادیث سے اللہ اکبر بتواتر ثابت ہوتا ہے۔

اسم کبیر کی دو توجیہ ہو سکتی ہیں اول تو یہ کہ یہ اسم صغیر کے مقابل میں واقع ہوا ہے مگر صغیر و کبیر بسا اوقات اجسام کی صفت میں واقع ہوتے ہیں لیکن ذات باری مقدار سے بالاتر ہے اس سے اس کا کبیر ہونا بلحاظ حجم اور مقدار کے نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی صغیر و کبیر کو عقلی مدارج کے لحاظ سے بھی اعتبار کیا کرتے ہیں چنانچہ سردار قوم کو کبیر القوم اور ایک بڑے صاحب علم کو کبیر فی الدین بولا کرتے ہیں اور ہر دو میں ان کے درجہ عالیہ کا لحاظ کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید کی آیۃ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ میں یہی معنی مراد ہیں چونکہ ذات باری عزاسمہ صفات ذاتیہ میں تمام موجودات سے اکمل و اشرف ہے اس لئے تمام شیء

موجودات کی نسبت وہ کبیر ہے اور تمام موجودات بمقابلہ اس کی ذات کے صغیر دوم کبیر ہونا ذات باری کا اس جہت سے ہے کہ وہ مخلوقات کی مشابہت سے برتر ہے اس صورت میں جملہ عن ماخوذ ہوگا یقال کبر عنہ اس لئے توجیہ یوں ہوگی ھو کبیر عن مشابھۃ الخلق یعنی وہ موجودات کی مشابہت سے برتر ہے ہر دو توجیہ کے رو سے یہ اسم مجملہ اسماء تنزیہ کے ہے۔

اسم اکبر کی بھی دو توجیہ ہو سکتی ہیں اول ھو اکبر من کل ماسواہ یہ توجیہ جملہ اللہ اکبر کے شروع نماز میں قائم کرنے کی حکمت کو واضح کر دیتی ہے کیونکہ جب مصلی کو یہ علم ہو کہ وہ ذات مقدس جس کے حضور میں کھڑا ہے تمام موجودات سے اکمل و اشرف ہے تو اس کی توجیہ کسی غیر اللہ کی طرف مصروف نہیں ہوتی مگر مبرد جو امام لغت عربیہ ہیں لکھتے ہیں کہ یہ توجیہ صحیح نہیں کیونکہ یہ لفظ جو صیغہ افعل تفضیل ہے ایسی دو چیزوں کے درمیان استعمال کیا جاتا ہے جن میں مشابہت اور مجانست ہو اور ایک دوسری کی نسبت وصف کبر میں بڑھی ہوئی ہو مگر اللہ تعالیٰ اور موجودات میں کسی قسم کی مشابہت اور مجانست نہیں لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عام لوگ موجودات میں سے غیر اللہ کی بھی تعظیم و تکریم حقیقی کا اہل نہیں ہو سکتا اور ابو عبیدہ کہتے ہیں اکبر اس جملہ میں معنی کبیر کے ہے یعنی صیغہ افعل کے معنی میں مستعمل نہیں اور ایسا استعمال اہل زبان میں جاری ساری ہے اور وہ فرزدق کا شعر دلیل سند پیش کرتے ہیں جیسا قال۔

ان الذی سمک السماء بنی لنا
بیتاً دعا ئمہ اعز و اطول

اس شعر میں اعز اور اطول بمعنی عزیز و طویل مستعمل ہوئے ہیں۔ (یعنی وہ ذات جس نے آسمان کو بلند کیا اس نے ہمارے لئے ایک گھر (شرافت کا گھر) بنایا ہے جس کے ستون بڑے مضبوط اور طویل ہیں۔)

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کبریاء سے مراد کمال ذات کے اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

کمال ذات سے کمال وجود مراد ہے اور کمال وجود سے دو چیزوں کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے اول یہ کہ وہ وجود ازل سے ابد تک پائدار ہو اور اگر کوئی وجود ایسا نہ ہو بلکہ اس کے اول و آخر میں اس کا عدم تجویز کیا جا سکے تو وہ ناقص ہو گا یہی وجہ ہے کہ کسی بڑی عمر کے آدمی کو کبیر السن بولا کرتے ہیں نہ عظیم السن سو جب ایک محدود البقا انسان کو کبیر بول سکتے ہیں تو غیر محدود البقا بدرجہ اولے کبیر ہو گا۔

دوم کمال وجود سے یہ مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی وجود تمام دیگر موجودات کا منبع قرار پا سکے سو بجز ذات باری اور کوئی موجود ایسا نہیں ہو سکتا۔

عظمت اور کبریاء گو بظاہر ایک ہی مفہوم کو ظاہر کرتے ہیں مگر ہر دو میں فرق ہے حدیث قدسی الکبریاء ردائی والعظمۃ ازاری میں اسی فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کبریاء عظمت کی نسبت زیادہ عظیم الشان وصف ہے یہی وجہ ہے کہ کبریاء کو رداء اور عظمت کو ازار سے تعبیر کیا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کے صفات کمال کے آثار دوسرے لوگوں تک پہنچ جائیں اور جو اس شخص سے مجالست کرے وہ اس کے فیضان کمال سے بے بہرہ نہ رہے اور انسان کو درجہ کمال اس وقت حاصل ہوا کرتا ہے۔ جب اس کی عقل پرہیزگاری علم درجہ کمال تک ترقی کر جاتے ہیں لہذا نوع انسان میں کبیر وہ شخص ہوا کرتا ہے جو عالم تقی صاحب ارشاد ہو اور لوگ اس کے فیض علوم سے مستفیض ہوں ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ علماء سے مجالست اور حکماء سے مصاحبت اور کبراء سے مخالطت رکھو علماء علوم شرعیہ کے محافظ ہیں حکماء اسرار معرفت کے جامع ہوتے ہیں اور کبراء ہر دو منصب کی قابلیت رکھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو آفتاب عالم تاب کی طرح خود روشن ہو کر در و بام عام کو اپنے انوار سے روشن کر دیتے ہیں اور ان کا وجود بہت نادر ہوتا ہے۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے۔ باب علم و معرفت کشادہ ہو اور اگر کھانے کی چیز پر پڑھ کر زوجین کو کھلایا دے تو باہم الفت ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْحَفِیْظُ

جل جلالہ

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حفیظ مبالغہ ہے اسم حافظ کا اور حافظ کا مفہوم حقیقت حفظ کے سمجھ لینے پر موقوف ہے سو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اول وجود موجودات کو لگاتار جاری رکھنا اس کی متضاد حالت کا نام معدوم کر دینا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ تمام موجودات کا خواہ زمینی ہو یا آسمانی حافظ ہے دو متضاد اشیاء کو اپنی اپنی حد میں محدود رکھنا اور ایک کو دوسرے پر غلبہ پانے سے روکنا مثلاً حرارت کو برودت سے اور رطوبت کو یبوست سے علیحدہ علیحدہ تعدی سے محفوظ رکھنا غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ترکیب بدن میں ہر چہار متضادہ کیفیات کو کس حکمت بالغہ سے جمع کیا ہے اگر ایک ان میں سے غائب آجائے تو زندگی باطل ہو جاتی ہے اور گر ان میں سے کوئی ایک غلبہ پانے لگے تو بذریعہ غذا اور دوا کے اس کو روکا جا سکتا ہے یہ تو اندرونی سلسلہ اسباب ہے جس سے انسان کی زندگی قائم رہ سکتی ہے رہا بیرونی طور پر انسان کی حفاظت کا سلسلہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ کس قدر اسباب ہمارے چاروں طرف ایسے موجود ہیں جن کے استعمال سے انسان اپنی زندگی کو محفوظ رکھ سکتا ہے اور یہ سب اس حافظ حقیقی کی عنایت

ازلی کا نتیجہ ہے نباتات کو دیکھو کہ ان کے محفوظ رکھنے کے لئے کس قدر اسباب مناسب پیدا کر دیئے ہیں اگر ان کی تفصیل کرنے لگیں تو انسان کی عمر ہرگز متحمل نہیں ہو سکتی اگر ہم اس سلسلہ اسباب کی وسعت پر غور کریں جو تمام ذرات موجودات کی حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہے تو عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کبھی حفظ بمعنی ضد تضییع بھی مستعمل ہوتا ہے مثلاً حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى لاتهملوها ولاتضيعوها چنانچہ آیۃ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ میں یہی معنی ملحوظ ہیں اور آیۃ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ میں بھی یہی معنی زیادہ چسپاں ہیں کیونکہ کلام الٰہی کو تحریف و تبدیل سے بذریعہ اسباب مناسبہ کے محفوظ رکھنا اس کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔

اگر ہم اپنے دینی حالات میں غور کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک آن کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے باہر نہیں جا سکتے بڑے بڑے عقلاء روزگار جو دنیا بھر کے علوم و فنون میں یگانہ تھے دین کے معاملہ میں صرف ایک ہی شبہ یا اشکال کے پیش آنے پر گمراہ ہو جاتے رہے اور عمر بھر ورطہ ضلالت سے نہ نکل سکے لیکن اگر کسی کو حفاظت الٰہی ایسے ورطہ میں مبتلا ہونے سے بچا لے تو وہ محفوظ رہ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ لوجیہ قرآنیہ میں وارد ہوا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ اس دعاء میں حفاظت الٰہی کی استدعا کی گئی ہے اور آیت لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ اور نیز آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ میں بھی اسی حفاظت کی طرف اشارہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جب ہم دنیوی حالات میں غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ ہمارے چاروں طرف اسباب ہلاکت موجود ہیں مگر اس نے ہمیں ان کے دفع کے اسباب بھی عطا فرما دیئے ہیں چنانچہ ہماری حفاظت کے لئے ملائکہ متعین ہیں قال اللہ تعالیٰ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ

toobaa-elibrary.blogspot.com

امراللہ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ عقلی طور پر بھی ذات باری کا حافظ ہونا ثابت ہے کیونکہ جس طرح تمام ممکنات عدم سے وجود میں آنے کے لئے کسی مرجح کی محتاج ہے اسی طرح موجود ہو کر اپنے وجود کے قائم رکھنے میں بھی حفاظت کی محتاج ہے اس لئے صرف ذات باری ہی محافظ ہو سکتی ہے چنانچہ آیت اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا میں اس امر کی طرف اشارہ ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے دو طرح بہرہ حاصل ہوتا ہے اول قوت نظری کی رو سے جس کی صورت یہ ہے کہ وہ بدعات اور شکوک اوہام سے اپنے اعتقادات حقہ کو محفوظ رکھے دوم قوت عملی کی رو سے جس کی صورت یہ ہے کہ شہوت و غضب کی اطاعت سے اپنے اعضاء اور قوی کی نگہداشت کرے اور اصل عظیم دربارہ حفاظت علم و عمل کے یہ ہے کہ صراط مستقیم شریعت کی شناخت کرے جس کی استدعا پانچ وقت نماز میں کی جاتی ہے کیونکہ پل صراط مستقیم قیامت کے دن پل صراط کی صورت میں جہنم کے اوپر کھینچا جائے گا جس پر چلنا اس موجودہ زندگی کے علم و عمل کی خوبی پر منحصر رکھا گیا ہے ہر ایک ایماندار کا فرض ہے کہ آج حسن اعتقاد اور حسن عمل کی حقیقت میں غور کر کے اصلاح کرے کیونکہ آج کی اصلاح در حقیقت ماعد اموت کی اصلاح ہے۔

امروز، دراں کوش کہ بینا باشی
حیران بجمال گل دلارا باشی
شرمت باد اچو کودکان در شب عید
تاچند در انتظار فردا باشی

حضرات مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ حفیظ وہ ذات ہے جو بندہ کو مصیبت کی حالت میں اظہار شکایت سے اور امن و عافیت کی حالت میں امتحان سے محفوظ رکھے بعض لکھتے ہیں کہ حفیظ وہ ذات ہے کہ اپنے بندہ کے باطن کو ملاحظہ اغیار سے اور ظاہر کو موافقت فجار سے محفوظ رکھے۔

بعض حضرات نے لکھا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اعضاء اور قوی کی حفاظت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے باطن کو ہر ایک قسم کے وساوس و شکوک سے محفوظ رکھتا ہے اور جب بندہ اس مقام میں استقامت حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اہل عالم کے لئے حجۃ اللہ کا منصب عطا فرماتا ہے۔

خاصیت

اس کا ذکر کرنے والا یا لکھ کر پاس رکھنے والا ہر خوف سے محفوظ رہے اگر درندوں کے درمیان سو رہے تو ضرر نہ پہنچے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُقِیْتُ

جل جلالہ

قال اللّٰہ تعالیٰ وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ مُّقِیْتًا اس اسم کی تشریح میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مقیت بمعنی مقتدر ہے اور وہ ایک اہل زبان کے شعر ذیل کو حجت میں پیش کرتے ہیں۔

وذی ضغن کففت النفس عنه
وکنت علی مساءته مقیتاً

میں کئی ایک کینہ توز دشمن ہیں جن کے مقابلہ سے میں نے اپنے تئیں روکا حالانکہ میں ان کی بدسلوکی پر پوری قدرت رکھتا تھا ازہری شمر سے راوی ہیں کہ مقیت خاص لغت قریش کا لفظ ہے دوم وہ ذات جو مخلوق کے قوت بہم پہنچانے کی متکفل ہے فراء نحوی کہتے ہیں کہ قاتہ اور اقاتہ ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں سوم یہ کہ مقیت مشتق ہے اقات علی الشیء سے جس کے معنی ہیں شہد علیہ کے چہارم ابو عبیدہ معمر بن مثنی کہتے ہیں کہ مقیت بمعنی حفیظ ہے امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مقیت میں قدرت و علم ہر دو کا مفہوم

شامل ہے اس لئے یہ اسم قادر اور علیم ہر ایک سے زیادہ وسیع ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مقیت وہ ذات ہے جو اپنے بندہ کی مناجات کی اجابت فرمائے اور مصیبت و بلا کو دفع کرے بندوں کے قوت مختلف قسم کے ہیں اکثر تو مطعومات سے زندہ رہتے ہیں اور بعض ذکر الٰہی سے اور خواص العباد کے لئے مکاشفات و مشاہدات بمنزلہ غذا کے ہیں حدیث ابیت عند ربی یطعمنی و یسقین (یعنی میں اپنے رب کے پاس رات بسر کرتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے) میں اس غذاء کی طرف اشارہ ہے۔

خاصیت

اگر روزہ دار اس کو مٹی پر پڑھ کر یا لکھ کر اس کو تر کر کے سونگھے تو قوت اور غذائیت حاصل ہو اور اگر مسافر کوزہ پر سات بار پڑھ کر پھر اس سے پانی پیا کرے وحشت سفر سے مامون ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْحَسِیْبُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَکَفٰی بِاللّٰہِ حَسِیْبًا اس اسم کی تفسیر کے متعلق چند وجوہ بیان کئے گئے اول یہ کہ حسیب بمعنی کافی ہے اور چونکہ فعیل کا وزن مفعل کے معنے میں مستعمل ہے جیسے بدیع بمعنی مبدع اور الیم بمعنی مؤلم اسی طرح حسیب بمعنی محسب سمجھنا چاہیے اہل عرب بولتے ہیں۔

نزلت فلان فاکر منی واحسبنی ای اعطانی ماکفانی حتی قلت حسبی ومنه قوله تعالیٰ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ یہ امر بالخصوص قابل ذکر ہے کہ ہر ایک امیر میں کفایت کا منصب جز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں اگر بذریعہ اسباب متاسبہ کے کفایت حاصل ہو تو اسے بھی کفایت الٰہی کہنا چاہیے کیونکہ سلسلہ اسباب ہی کا خلق ہے بدا ہر ایک قسم کی کفایت فی الحقیقت ذات باری کا حق ہے اس لئے کافی حقیقی وہی ذات واحد لاشریک ہے نہ کوئی اور یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جس صورت میں کافی صرف ذات باری ہے تو آیت یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ کے کیا معنے ہوں گے کیونکہ اس آیت میں حسب یعنی کافی ہونا ذات باری اور اہل ایمان ہر دو

کی طرف نسبت کیا گیا ہے؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں دو مذہب ہیں اور ہر دو قواعد عربیت کی رو سے صحیح ہیں اگر من اتبعک کا عطف لفظ اللہ پر کریں تو معنی یہ ہوں گے کہ اے نبی تجھے اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کافی ہیں اس صورت میں مذکورہ بالا اعتراض لازم آتا ہے اور اگر اس کا عطف حرف کاف پر کریں تو پھر اعتراض لازم نہیں آتا کیونکہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تجھے اور اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کافی ہے ان ہر دو معنی کو مفسرین نے قلمبند کیا ہے شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ عطف ضمیر کاف پر راجح اور قوی ہے امام رازی بھی اپنی کتاب لوامع میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی روایت کو نقل کرتے ہیں اور حافظ ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد کے شروع میں کئی ایک وجوہ اس روایت کی تقویت میں بیان کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ ان حضرات کو صرف اس خیال نے اس توجیہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ نسبت کفایت کی غیر اللہ کی طرف صحیح نہیں ورنہ عطف من اتبعک کا اسم اللہ پر ہی صحیح مذہب ہے اور یہ خیال کہ نسبت کفایت کی غیر اللہ کی طرف لازم آتی ہے قوی نہیں کیونکہ نسبت ذات باری کی طرف حقیقی ہے اور اہل ایمان کی طرف مجازی اور قرآن مجید میں ایسی کئی ایک آیات ہیں جن میں ایک فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ اور رسول اکرمؐ اور اہل ایمان کی طرف کی گئی ہے مگر ہر سہ کی نوعیت ایک نہیں بلکہ علیحدہ علیحدہ اعتبار سے مع ھذا جب ہم آیت یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ کے سیاق و سباق پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مذکورہ بالا دعوے بالکل صحیح ہے کیونکہ اس سے پہلے الفاظ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ اس کی تائید کے لئے کافی شہادت ہیں۔

دوم حسیب بمعنی محاسب ہے جیسے ندیم بمعنی منادم اور جلیس بمعنی مجالس چنانچہ آیت کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا میں حسیب بمعنی محاسب ہی موزوں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں سے قیامت کے دن حساب لے گا جن میں سے بعض کی نسبت تو حساب یسیر (آسان) اور بعض کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

نسبت حساب شدید لینے کا حکم وارد ہوا ہے۔

سوم حسیب بمعنی شریف ہے اس صورت میں حسب بمعنی شرف سے مشتق ہوگا۔ معنی یہ ہوں گے کہ حسیب وہ ذات ہے جو حقیقی مجد و شرافت اور اعلیٰ جلال و کمال کے صفات سے متصف ہو۔

انسان کامل کو اس اسم سے جو بہرہ حاصل ہوتا ہے اس کی تفصیل یوں ہے کہ اگر حسیب بمعنی کافی ہو تو اسی صورت میں حسیب وہ شخص ہوگا جو اہل حاجت کی حاجت روائی کے لئے بظاہر سبب بنے اور اگر حسیب بمعنی محاسب ہو تو حسیب وہ شخص ہوگا جو اپنا محاسبہ آپ کرتا ہے اور انسان کا آپ اپنا محاسبہ کرنا کمال نفس کی دلیل ہے اور بجز اہل معرفت کے دوسروں کو نصیب نہیں ہوتا ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے حاسبو انفسکم قبل ان تحاسبوا یعنی (قیامت کو) حساب لئے جانے سے پہلے آپ اپنا محاسبہ کیا کرو اور اگر حسیب بمعنی شریف ہو تو اس صورت میں حسیب وہ شخص ہوگا جو معرفت اور طاعت خداوندی میں استقامت حاصل کرلے کیونکہ اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اور کوئی شرف نہیں ہو سکتا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جو اپنے بندہ کے انفاس کا شمار کیا کرے اور اپنے خوف و عذاب کو اس سے روک دے بعض لکھتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جس کی خیر کی امید اور جس کے شر سے امن حاصل ہو بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ حسیب وہ ذات ہے جو اپنے فضل سے بندہ کو کافی ہو اور اپنے احسان سے آفات کو روک دے اور بعض یوں فرماتے ہیں کہ حسیب وہ ذات ہے جو اہل حاجت کی التجاء پر ان کی حاجت روائی کرے اور کسی حکم کو نہایت استحکام کے ساتھ جاری فرمادے۔

خاصیت

اگر کسی سے تشدد حساب کا اندیشہ ہو یا کسی بھلائی مزدوری سے کسی معاملہ میں خوف ہو تو سات روز تک قبل طلوع آفتاب و بعد مغرب اس کو تیس مرتبہ پڑھا کرے۔

الجلیل

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا اور اس کے معنی صاحب جلال کے ہیں البتہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام اس آیۃ میں ذات باری کے لئے دو قسم کے صفات کا ذکر ہے یعنی ذوالاکرام سے صرف ذات کامل کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے مگر ذوالجلال سے مراد کامل الذات والصفات ہے اور صفات دو قسم کے ہیں اول صفات سلبیہ یعنی ایسے صفات جن سے ذات باری پاک ہے مثلاً مثل یا نظیر یا مکان و زمان وغیرہ سے بالاتر ہونا دوم صفات ثبوتیہ جو ذات باری کے لئے ثابت ہیں مثلاً علم و قدرت وغیرہ۔

اس قدر تشریح کے بعد لفظ جلیل کی لغوی تحقیق یوں ہے کہ فعیل بمعنی مفعول (اسم فاعل) مستعمل ہے اس لئے جلیل بمعنی مجل ہوگا یعنی ایسی ذات جو اہل ایمان کو اعزاز و اکرام بخشے اور ان کے ثواب کو عظیم بنائے اور بمعنی فاعل بھی صحیح ہے اس لئے اس کی توجیہ یوں ہوگی کہ جلیل وہ ذات ہوگی جو تمام صفات جلال سے بدرجہ کمال موصوف ہو اور بمعنی مفعول بھی جائز ہے توجیہ یوں ہوگی کہ جلیل وہ ذات ہے جو اس امر کی مستحق ہو کہ عقلاء اس کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

جلال و کبریاء کا اعتراف کریں اور اس کی الوہیت کا انکار نہ کریں۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ تمام عقائد باطلہ اور خلق ذمیمہ سے بری ہو کر معارف حقہ اور اخلاق فاضلہ سے متصف ہو جاتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جلیل وہ ہے کہ جو شخص اس کی طرف قصد کر کے آئے عزت پائے اور جو اس کی مخالفت اور تحقیر کرے ذلیل ہو بعض لکھتے ہیں کہ جلیل وہ ہے جو اہل معرفت کے دلوں میں جلیل القدر اور اہل محبت کے دلوں میں بلند رتبہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ جلیل وہ ذات ہے جس کے علو صفات کی وجہ سے کوئی اس پر غالب نہ آسکے اور جس کے کبریاء کی وجہ سے کوئی شخص اس کے کمال جلال کا ادراک نہ کر سکے اور بعض نے لکھا ہے کہ جلیل وہ ذات ہے جو قلوب محبین کو وصف جلال اور نعت جمال سے مکاشفہ کا مقام عطا فرماوے اور بعض فرماتے ہیں کہ جلیل وہ ذات ہے جو اولیاء کو اپنے فضل سے عزت بخشے اور اعداء کو اپنے عدل سے ذلیل کر دے۔

واضح ہو کہ جلال و جمال ہر دو صفات باری کی قسمیں ہیں اور ہر دو مظاہر عالم میں جلوہ افروز ہیں جلال میں صفات قہر و سطوت و غلبہ اور جمال میں صفات رحمت مغفرت احسان داخل ہیں گو ہر دو ایک ہی ذات مقدس کے آثار ہیں مگر مختلف موارد کے لحاظ سے عالم کائنات میں ان سے مختلف نتائج ظہور میں آتے رہتے ہیں جس طرح وہ ذات احدیت جلال کی مالک ہے اسی طرح جمال بھی اسی کی وصف ہے وہی قوت غالبہ کی مستحق ہے اور وہی ہر ایک قسم کے انعام کی منبع ہے اور وہ جمیل مطلق ہے اور اسی لئے اس کے حسن ذاتی کا ادراک محال عقلی ہے جس طرح اہل ظاہر اشیاء کے حسن ظاہری پر دلدادہ ہوتے ہیں اسی طرح اہل بصیرت حقائق اشیاء کی خوبی پر محو حیرت ہوتے ہیں اور ان کے قلوب پر تجلیات جلال و جمال کا ہر وقت ورود ہوتا ہے تجلیات جلال کا اثر خشیت و خشوع ہے اور تجلیات جمال کا محبت و انس

کشیدن خنجر تسلیم
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

خاصیت

اس کو بکثرت ذکر کرنے سے یا مشک و زعفران سے لکھ کر پاس رکھنے سے قدر و منزلت زیادہ ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْکَرِیْمُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ اور پھر فرمایا اقرا وربک الاکرم واضح ہو کہ اہل عرب ہر ایک صفت محمود کو کرم سے تعبیر کیا کرتے ہیں ایک حدیث میں وارد ہوا ہے یوسف اکرم الناس اس جملہ میں کرم سے کرم نسب مراد ہے اہل عرب بولتے ہیں فلاں کریم الطرفین کبھی اس لفظ کا اطلاق صورت حسنہ پر بھی آتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّ ھٰذَا لَاَمْلَکٌ کَرِیْمٌ اور جنت کی وصف میں فرمایا مقام کریم کبھی اس لفظ کا اطلاق معنے عزیز کیا کرتے ہیں چنانچہ آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ میں اکرم بمعنی عزیز ہے سلیمان علیہ السلام کے مکتوب کو کتاب کریم کہا گیا ہے کیونکہ ایک جلیل القدر مضمون پر مشتمل تھا جس کے منافع بیشمار تھے اسی لئے بڑی دودھیلی اونٹنی کو بھی نافۂ کریمۃ بولا کرتے ہیں درخت تمور کو کرمہ بولنا بھی اسی خیال پر مبنی ہے کیونکہ وہ کثیر المنافع اور بآسانی درخت سے اتارا جا سکتا ہے۔

اس لغوی تشریح کے بعد معلوم ہونا چاہئے کہ کرم بمعنی شرف و طہارت بجز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں کیونکہ وہی موجود حقیقی واجب

الوجود عدم اور دیگر نقائص سے منزہ و مبرا ہے اور اگر کرم بمعنی عزت ہو تو اس صورت میں بھی عزیز بجز ذات باری کے کوئی اور موجود نہیں ہو سکتا اور اگر کثیر المنافع ہونا مراد ہو تو ظاہر ہے کہ یہ وصف بھی بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں جو ہر ایک قسم کی خیرات کا مصدر ہے اور ذات باری کے کرم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا کہ وہ بلا استحقاق اور بلا سوال اپنے خیر و احسان سے امتیاز بخشتا ہے اور اگر کوئی داعی یا کریم العفو کہہ کر اسے پکارے تو وہ اس داعی کے گناہ کو مٹا کر نیکی کو اس کے نامہ اعمال میں ثبت فرماتا ہے اور دنیا میں اپنے بندوں کے عیوب پر پردہ پوشی کرتا ہے اور مغفرت عطا فرما کر ان کے گناہوں کو انہیں یاد نہیں دلاتا اور گر وہ تھوڑی سی طاعت بھی بجا لائیں تو انہیں ثواب جزیل عطا فرماتا ہے اور اس کے کرم پر مبنی ہے کہ اس نے تمام اشیاء کو انسان کی خاطر پیدا کیا اور دار آخرت کو جس کی وصف میں وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ وارد ہوا ہے تیار کر کے گوناگوں نعمتوں کا وعدہ فرمایا۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو صاحب قدرت ہو کر عفو کرے اور وعدہ کر کے وفا کرے اور زائد از امید عطا فرمائے اور جب دے تو اسے ہرگز یہ پروا نہ ہو کہ کس قدر دیا ہے اور کس کو دیا ہے اور کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے سے ہراس ہو اور حاجتمندوں کی حاجت روائی کے لئے کسی وسیلہ یا شفیع کو جائز نہ رکھے اور اپنے ہاں پناہ لینے والے کو اپنی نصرت سے محروم نہ کرے سو جس ذات کے لئے یہ تمام صفات مجتمعاً حاصل ہو جائیں وہ کریم کہلانے کی مستحق ہے ایسی ذات بجز ذات باری کے کوئی اور نہیں ہو سکتی اس لئے کریم مطلق صرف وہی ذات ہے پھر فرماتے ہیں کہ بندہ کو محنت و مشقت کے کسی قدر یہ صفات حاصل ہو سکتے ہیں اس لئے سے بھی کریم بولا کرتے ہیں لیکن بمقابلہ ذات باری یہ صفات نہایت ناقص ہیں مگر انسان کریم وہی ہے جو مجرموں کے قصور کو معاف کر دے اور اصناف خلائق کو ہر ایک قسم کی

toobaa-elibrary.blogspot.com

منفعت سے مستفید کرے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو بلا اکلہار منت احسان کرے اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو بندہ کو کسی وسیلہ کا محتاج نہ رہنے دے اور بعض لکھتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو اہل عصیان کو قبول توبہ سے ناامید نہ کرے حارث محاسبی کہتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو اس امر کی پرواہ نہ کرے کہ کس کو دیتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ کریم وہ ذات ہے جو باوجود عصیاں کے احسان کرے اور بعض نے اور بھی توجیہات لکھی ہیں۔

خاصیت

سوتے وقت بکثرت پڑھا کرے تو لوگوں کے قلب میں اس کا اکرام واقع ہو۔

دعاء

اعوذ بوجه الله الكريم النافع وبكلمات الله التامات التي لايجاوزهن برولا فاجر من شر ما خلق وذراه وبراه ومن شر ما ينزل من السماء ومن شر ما يعرج فيها ومن شر ما ذرافي الارض ومن شر مايخرج منها ومن شر فتن الليل والنهار ومن شر كل طارق الا طارقاً يطرق بخير يارحمن۔ (حصن حصین)

اَلرَّقِیْبُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ اور پھر فرمایا وكان الله على كل شئ رقيباً اس اسم کی توجیہ میں دو قول بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ رقیب کے معنی ہیں کسی چیز کو دوام طور حفاظت زیر نظر رکھنا اور آدمیوں میں رقیب ایسے شخص کو بولتے ہیں جو کسی چیز کی حفاظت پر موکل ہو اس طرح پر کہ وہ اس سے کسی حال میں بھی غفلت کو جائز نہ رکھے یقال رقبت الشئ ارقبه اذا راعيته و حفظته قال اللہ تعالیٰ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ اس آیت میں رقیب سے وہ فرشتہ مراد ہے جو بندوں کے نامہ اعمال کو لکھتا اور ان کے الفاظ کو محفوظ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رقیب ہونے سے یہ مراد ہے کہ وہ ان کے افعال و اقوال کو دیکھتا اور ان کا علم رکھتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّنِيْ مَعَكُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰى اور پھر فرمایا يَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ دوم یہ کہ ارتقاب بمعنی انتظار ہے قال اللہ تعالیٰ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ چونکہ انتظار ذات باری کے لئے محال ہے اس لئے اس کے لازم

toobaa-elibrary.blogspot.com

معنی یعنی طلب مراد ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ادائے حق عبودیت کا طالب ہے اس لئے وہ رقیب ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس رقیب کے معنی العلیم الحفیظ کے ہیں یا یوں کہو کہ اس رقیب کا مفہوم علم و حفظ پر مشتمل ہے مگر طریق دوام و لزوم نہ مطلق علم و حفظ پر اور عبد کا کمال وصف مراقبہ میں یہ ہے کہ وہ اس امر کا یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک امر میں اس کا پاسبان شاہد حال ہے اور نفس و شیطان ہر دو اس کے دشمن ہیں جو اس کی گھات میں لگے ہیں اور غفلت و مخالفت پر برانگیختہ کرتے رہتے ہیں انسان کامل کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے مکائد سے کبھی غافل نہیں ہوتا بلکہ ہر وقت ان کی روک تھام کے لئے مستعد رہتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مراقبہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو قلب کے اندرونی حالات اور کیفیات کا علم ہو ان کیفیات و حالات کی ہمیشہ نگرانی کرتے رہنا ہی مراقبہ ہے اور یہ مراقبہ تمام کمالات خیر و سعادت کا زینہ ہے اور یہ بات اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے تمام اقوال و افعال سے آگاہ ہے اور وہ ان پر محاسبہ کرے گا یہ یقین جب غالب ہو جاتا ہے تو بندہ سے گناہ کا ارتکاب نہیں ہوتا چنانچہ عبد اللہ بن عمر کی نسبت مروی ہے کہ انہوں نے ایک غلام کو بکریاں چراتے دیکھا آپ نے اس سے کہا کہ ایک بکری میرے پاس بیچ ڈالو اس نے کہا کہ بکریاں میری نہیں آپ نے کہا کہ تم کہہ دینا کہ بھیڑیا پھاڑ گیا ہے اس نے جواب دیا کہ خدا کہاں ہے؟ یہ قول آپ کے دل میں ایسا موثر ہوا کہ اس کے آقا سے خرید کر آزاد کر دیا کہتے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ غلام کا جواب یاد آیا کرتا۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو باطن کے اسرار سے قریب اور عند الاضطرار مجیب ہو بعض لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو تمام ضمائر و مخفیات پر مطلع اور شاہد ہو بعض لکھتے ہیں کہ رقیب وہ ذات ہے جو تمام

حادثات کو ان کے وجود سے پہلے ہی جانتا اور دیکھتا ہو۔

خاصیت

اس کے ذکر کرنے سے مال و عیال محفوظ رہے اور جس کی کوئی چیز گم ہو جائے اس کو بہت پڑھے تو ان شاء اللہ تعالیٰ مل جاوے اور اگر اسقاط حمل کا اندیشہ ہو تو اس کو سات مرتبہ پڑھے اور ساقط نہ ہو اور سفر کے وقت جس بال بچہ کی طرف فکر ہو اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر سات مرتبہ پڑھے تو مامون رہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُجِیْبُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ اس اسم کی دو طرح پر تفسیر کی گئی ہے اول تو یہ کہ اجابت بمعنے کلام ہے اس صورت میں مشتق ہوگا اجبتہ' اجابۃ و جوابا دوم یہ کہ اجابت کے معنے ہیں سائل کو اس کا مطلوب دینا لفظ مستجاب الدعوات انہیں معنی سے ماخوذ ہے اور آیت اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ الخ میں بھی یہی معنے ملحوظ ہیں چنانچہ اضطرار اس معنے کی تعیین کے لئے کافی ہے اور انہیں معنی کی تفسیر میں یہ حدیث وارد ہے ان اللہ یستحی ان یرد د عبدہ صفراء یعنی اللہ تعالیٰ کو شرم آتی ہے کہ وہ اپنے بندہ کے ہاتھ کو خالی رد کرے۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ مجیب میں صرف قبول دعا کا ہی مفہوم نہیں بلکہ مجیب وہ ذات ہے جو قبل سوال عطاء نعمت کرے یہ امر بجز ذات باری کے کسی اور سے متصور نہیں کیونکہ قبل سوال حاجت مندوں کی حاجت کا علم اسی کو ہو سکتا ہے بلکہ اس کو ازل ہی سے یہ علم حاصل ہے اس لئے اس نے مخلوقات کی حاجت روائی کے لئے اسباب ضروریہ اور ان کے طریق استعمال کو پیدا کر دیا

ہے۔

انسان کامل کو یہ حظ ہونا چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے کام کی اجابت کرے پھر بندگان خدا کے حاجات کو بقدر طاقت رفع کرے اور اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو لطف کلام کے ساتھ انہیں رخصت کر دے۔ قال اللہ تعالیٰ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ اجابت دعوت (ضیافت) بھی اسم مجیب کے حظ میں داخل ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا لودعیت الی کراع لا جبت ولواھدی الی ذراع لقبلت یعنی اگر میں ایک پائچہ گوسپند کی (ضیافت) پر مدعو کیا جاؤں تو میں داعی کی دعوت کی اجابت کروں گا اور اگر میری طرف ذراع (گوشت بازو) ہدیہ بھیجا جاوے تو میں قبول کر لوں گا یہ فرمان حضور علیہ السلام کی اعلیٰ اخلاقی حالت پر دال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کو ہرگز یہ منظور نہیں تھا کہ کوئی آپ سے ناامید یا رنجیدہ خاطر رہے برخلاف اس کے اکثر متکبرین اہل دنیا کا شیوہ ہے کہ غرباء کی دعوت پر حاضر نہیں ہوتے بلکہ ایسے مواقع پر شامل ہونے کو اپنی ہتک خیال کرتے ہیں ایسے لوگوں کو اسم مجیب سے کچھ بہرہ نہیں ہوتا۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اپنی طاعت کی طرف دعوت کی ہے اگر بندہ اجابت کرے تو اللہ تعالیٰ ہر ایک کی دعا جو بندہ کرتا ہے اجابت فرماتا ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مجیب وہ ذات ہے جو دعائے مضطرین کی اجابت فرمائے اور سائلین کی امیدوں کو ناکام نہ رکھے۔

خاصیت

دعا کے ساتھ اس کو ذکر کرنا موجب قبولیت دعا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْوَاسِعُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ اور پھر فرمایا وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ یہ اسم مصدر سعۃ بفتح سین و کسر سین سے مشتق ہے جس کے معنی فراخ ہونے کے ہیں واضح ہو کہ واسع مطلق صرف ذات باری ہے کیونکہ اسی کی ذات تمام زمانوں میں بلحہ زمانہ کے وجود سے پہلے ازلی اور ابدا موجود ہے نیز اس کا علم تمام معلومات پر حاوی ہے اور ایک چیز کا علم اس کو کسی دوسری چیز کے علم سے روک نہیں سکتا اسی طرح اس کی قدرت تمام مقدورات ممکنہ پر مشتمل ہے علی ہذا القیاس اس کی سمع و بصر وغیرہ اور یہی حال اس کی رحمت اور احسان کا ہے کہ تمام ذرات کائنات کو شامل ہیں۔

اسم وسیع کا اسم مجیب کے بعد بیان کرنا اس نکتہ پر مبنی ہے کہ وہ ہر ایک محتاج کی اجابت دعا کو ایک ہی آن میں پورا کر سکتا ہے کیونکہ ایک کی اجابت دوسرے کی اجابت سے اس کو روک نہیں سکتی برخلاف انسان کے کہ اس کے صفات محدود ہیں اس لئے وہ ایک ہی آن میں مختلف امور کو سر انجام نہیں دے سکتا یہ امر بالکل نفس الامر ہے۔ بلحہ مشاہدہ اس کی تصدیق کرتا ہے کہ بعض

افراد انسانی ایسے محدود القوے ہوتے ہیں کہ وہ ایک ہی علم کے سیکھنے کی قدرت رکھتے ہیں اور بعض کئی ایک علوم میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں بلحہ اسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک ہی شخص امام رازی لکھتے ہیں کہ میرے پاس معتبر اشخاص نے بیان کیا (فاضل شعراء میں سے ایک شخص کی یہ حالت تھی کہ اسے اگر پانچ مختلف الوزن والقافیہ شعر طرح کے طور پر پیش کئے جاتے تو وہ ایک طرف شطرنج بازی میں لگا ہوتا اور دوسری طرف ہر ایک شعر کا جواب سائل کو دے دیتا تھا) ایک آن میں کئی ایک امور کو سر انجام دے سکتا ہے اور اگر اسی وصف کو ذات باری کی نسبت بدرجہ کمال ملحوظ رکھا جائے تو یہ بلاشک قابل تسلیم ہوگا کہ وہ ایک ہی آن میں تمام کائنات عالم کا مدد و منتظم ہے چونکہ ذات باری کے صفات غیر متناہی ہیں جن کے بیان میں سمندر اگر سیاہی بن جائیں اور درخت قلمیں تو پھر بھی ان کی غایت نامعلوم رہے گی اس لئے وہ ذات فی الحقیقت وسیع کہلانے کی مستحق ہے یعنی ماسوی اللہ جس قدر اشیاء کسی وصف میں وسیع ہوں گی ان میں باہم اضافی طور پر وسعت ہوگی اور اس لئے وہ محدود الوسعت ہیں مگر ذات باری کا علم قدرت سمع بصر رحمت وغیرہ صفات کی کوئی حد یا غایت نہیں اور جب یہ حد و غایت ہیں تو ان پر زیادتی ناممکن ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے کہ وہ علم و اخلاق میں وسعت حاصل کرے جس قدر اس کے علم و اخلاق میں وسعت ہوگی اسی قدر اس اسم کا مظہر بننے کا مستحق ہوگا۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کی برہان کے لئے کوئی غایت اور اس کے سلطان کی کوئی نہایت نہ ہو بعض فرماتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس سے قلوب کے خواطر کا اثر مخفی نہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کی غنا کی کوئی حد نہ ہو اور جس کے عطایا لامتناہی ہوں بعض لکھتے ہیں کہ واسع وہ ذات ہے جس کا احسان شامل اور عطا کامل ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے غناء ظاہری اور باطنی حاصل ہو اور فراخ حوصلگی، بردباری پیدا ہو۔

اَلْحَکِیْمُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ قبل ازیں اس اسم کی تفسیر میں گذر چکا ہے کہ لفظ مصدر حکمت سے مشتق ہے اور حکیم کے معنی ہیں صاحب حکمت اس لئے اس اسم کی توجیہ تین طرح پر ہو سکتی ہے اول یہ کہ فعیل بمعنی مفعل یعنی حکیم بمعنی محکم ہے۔

یعنی وہ ذات جس نے اشیاء کو نہایت استحکام اور حسن تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اس توجیہ کی رو سے مکھی مچھر وغیرہ اگرچہ زمین وآسمان کی نسبت کوئی استحکام نہیں رکھتے مگر حسن تدبیر اور حسن صنعت کی رو سے وہ قدرت ذات باری پر اسی طرح دلالت کرتے ہیں جس طرح زمین وآسمان چنانچہ آیت اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ اور آیت خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا میں اسی حسن تدبیر وصنعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

دوم حکمت سے مراد ہے افضل المعلومات کی بذریعہ افضل العلوم کی معرفت حاصل کرنا اس صورت میں حکیم بمعنی علیم ہوگا امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ افضل العلوم تو ذات باری ہے اور فضل علم ازلی جس میں کسی

toobaa-elibrary.blogspot.com

قسم کے نقص یا شک و وسوسہ کو دخل نہیں چونکہ کنہ ذات باری کا علم بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں اس لئے وہی ذات حکیم مطلق بھی ہے۔

سوم حکمت سے مراد ہے ذات باری کا ہر ایک امر ناشائستہ سے بری ہونا۔

قال اللہ تعالیٰ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا

واضح ہو کہ جو شخص جمیع اشیاء کا علم رکھتا ہو مگر ذات باری کی معرفت سے بے بہرہ ہو اسے حکیم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ افضل العلوم سے بے خبر ہوتا ہے اور حکمت جل العلوم ہے اور کسی علم کا شرف بمقدار شرف معلوم کے ہوتا ہے چونکہ حکمت کا معلوم معرفت ذات باری ہے اس لئے وہ اجل العلوم ہے سو عارف ذات باری ہی در حقیقت حکیم کہلانے کا مستحق ہوتا ہے اگرچہ وہ فصاحت و بلاغت اور دیگر علوم رسمیہ میں بظاہر نہ ہو اسی حکمت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا یعنی جس شخص کو حکمت دی جاتی ہے وہ خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نور معرفت سے اس کا قلب حقائق اشیاء کو کما ینبغی مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا کلام کلیات حقائق پر مشتمل ہو جاتا ہے نہ جزئیات پر مثلاً حضور علیہ السلام کے کلمات ذیل پر غور کرو۔ جو سراسر حکمت کا نچوڑ ہیں۔

(ا) راس الحکمة مخافة اللہ یعنی حکمت کا جزو اعظم خدا کا خوف ہے۔

(ب) الکیس من دان نفسه و عمل لما بعد الموت والعاجز من اتبع نفسه هواها وتمنی علی اللہ الا مانی یعنی دانا وہ شخص ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھتا ہو اور آخرت کے لئے عمل کرتا ہو اور عاجز وہ شخص ہے جو ہوائے نفس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے حسن آخرت کی آرزو رکھتا ہے۔

(ج) ماقل وکفی خیر مماکثر والهی یعنی قلیل چیز جو کافی ہو کثیر سے جو اللہ تعالیٰ یا آخرت سے روک دے بہتر ہے۔

(د) من اصبح معافاً فی بدنه امناً فی سربه عنده قوت یومه فکانما

حیزت له الدنیا بحذافیرها یعنی جو شخص تندرست ہو اور اپنے جھونپڑے میں آرام سے بیٹھا ہو اور موجودہ دن کی روزی رکھتا ہو یوں سمجھو کہ اس کو ساری دنیا مل گئی۔

(ہ) کن ورعاً تکن اعبد الناس وکن قنعاً تکن اشکر الناس یعنی پرہیزگار ہو تم سب سے بڑھ کر عبادت گذار ہو جاؤ گے اور قانع ہو تم سب سے بڑھ کر شکر گذار ہو جاؤ گے۔

(و) البلاء موکل بالمنطق یعنی بلا آدمی کے کلام سے وابستہ ہے۔

(ز) من حسن اسلام المرء ترک مالا یعنیه یعنی انسان کی خوبی اسلام فضول چیز کو ترک کرنے میں ہے۔

(ح) السعید من وعظ بغیره یعنی سعادت مند وہ شخص ہے جو دوسرے کی حالت کا مشاہدہ کر کے نصیحت قبول کر لیتا ہے۔

(ط) الصمت حکمة وقلیل فاعله یعنی خاموشی حکمت ہے اور اس کے اختیار کرنے والے کم ہیں۔

(ی) القناعة مال لاینفد یعنی قناعت ایسا مال ہے جو ختم نہیں ہوتا۔

(ک) الصبر نصف الایمان والیقین الایمان کله یعنی صبر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان ہے۔

یہ اور اس قسم کے کلمات حکمت کہلاتے ہیں اور ان کے بولنے والے کو حکیم کہتے ہیں۔

امام رازی لکھتے ہیں کہ حکماء نے حکمت کو علم کا مترادف قرار دیا ہے مگر خاکسار کا خیال ہے اور بعض محققین نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ علم اور حکمت ہر دو متحد المفہوم نہیں چنانچہ آیت اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ میں اگر حکمت اور علم ہر دو کو متحد المفہوم قرار دیں تو لفظ حکیم تاکید سے زیادہ کوئی فائدہ نہیں دے گا مگر علماء عربیت تاسیس (تاکید میں صرف تکرار لفظ ہوتا ہے اور اس تکرار سے کلام موکد ہو جاتا ہے مگر تاسیس میں زیادت معنی ملحوظ ہوتی ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

یعنی دوسرے لفظ میں پہلے کی نسبت کوئی زیادہ بات مد نظر ہوتی ہے) کو تاکید سے لوٹے قرار دیتے ہیں اس لئے لفظ حکیم لفظ علیم سے کسی زائد معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکمت کمال قوت علمی اور کمال قوت عملی ہر دو کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ انسان انہیں ہر دو قوت سے درجہ کمال کا مستحق ہوتا ہے اگر کسی شخص میں کمال علم ہو اور پیرایہ عمل سے عاری ہو تو اسے صاحب کمال نہیں کہہ سکتے چنانچہ علم الٰہیات کے علماء نے بھی انہیں ہر دو قوت کے کمال پر حصول حکمت کو موقوف رکھا ہے اور وہ تقسیم حکمت میں ہر دو اقسام علوم یعنی نظری (علمی) اور عملی کو شمار کیا کرتے ہیں اور قرآن مجید نے بھی ہر دو قوت علمی و عملی کے کمال میں درجات عالیہ اخرویہ کو محدود کیا ہے چنانچہ الفاظ امنوا (کمال علم) وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (کمال عمل) انہیں ہر دو قوت کے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اگر کمال علم و عمل مفہوم حکمت میں ملحوظ نہ ہوتا تو حکمت کو خیر کثیر کے لفظ سے نہ تعبیر کیا جاتا اور نہ انبیاء علیہم السلام کے لئے مقام مدح و فضیلت میں اس کو لایا جاتا دیکھو داؤد علیہ السلام کی نسبت یوں وارد ہوا ہے۔ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ حکیم وہ ذات ہے جو ہر ایک امر کا صحیح اندازہ باندھے اور تدبیر امور میں عین صواب پر چلے بعض لکھتے ہیں کہ حکیم وہ ذات ہے جو اغراض سے بری ہو اور اس کے فعل پر گنجائش اعتراض نہ ہو۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرنے سے مصائب دفع ہوں اور دروازہ علم و حکمت کشادہ ہو۔

دعاء

لا اله الا الله الحليم الحكيم لا اله الا الله رب العرش العظيم لا اله الا الله رب السموات والارض ورب العرش الكريم (ترمذی)

اَلْوَدُوْدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ لغت میں ود کے معنی محبت اور دوستی کے ہیں اس اسم کی توجیہ تین طرح پر ہو سکتی ہے اول یہ کہ فعول بمعنی فاعل لیا جائے یعنی ودود بمعنی واد ہو اس صورت میں اس کے معنی محب کے ہوں گے قال اللہ تعالیٰ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ مگر اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ انہیں ہر ایک قسم کی خیرات پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے اس توجیہ کی رو سے ود اور رحمت قریب المفہوم ہو جائیں گے کیونکہ رحمت الٰہی کے معنی بھی ارادہ ایصال خیر کے ہیں ہاں ان ہر دو میں ایک لطیف فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ رحمت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس کا مورد یعنی مرحوم کوئی محتاج ضعیف ہو مگر ود میں یہ امر ملحوظ نہیں بلکہ ود ابتداء انعام و احسان کی مقتضی ہے دوم یہ کہ ودود وہ ذات ہے جو متقیوں کو خلقت کے نزدیک محبوب بنا دے چنانچہ فرمایا سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا سوم یہ کہ ودود بمعنے مودود ہو جیسے رکوب بمعنے مرکوب مفہوم یہ ہوا کہ وہ ذات جو قلوب اولیاء میں محبوب ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

انسان کامل کو اس امر سے یہ میرہ ہوتا ہے کہ وہ طریق مشروع پر بندگان خدا سے پورا احسان کرتا ہے بلکہ جو اپنے لئے چاہتا ہے وہی دوسروں کے لئے چاہتا ہے اور جب اس سے زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو وصف ایثار سے متصف ہو جاتا ہے اس حالت میں وہ اپنی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے بنی نوع کی ضرورتوں کے پورا کرنے میں سعی کرتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْكَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ اسی مقام پر ایک عارف کا قول ہے اریدان اکون جسراً علی النار یعبر علی الخلق ولایتادون بها یعنی میں چاہتا ہوں کہ دوزخ کے اوپر پل بن جاؤں جس پر لوگ گذر جائیں اور تکلیف نہ پائیں اللہ اکبر کس درجہ کا ترحم ہے اس مقام پر عارف کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ رحم مجسم بن جاتا ہے اور کسی شخص کی دشمنی اور کینہ اس کو احسان اور ایثار سے نہیں روک سکتے یہی وجہ ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے دندان مبارک غزوہ احد میں شہید ہو گئے تو مخالفین کی بد سلوکی حضور علیہ السلام کی خیر خواہی میں کچھ مزاحم نہ ہو سکی چنانچہ آپ کی زبان حقائق ترجمان پر باگاہ رب العزت میں یہ کلمات جاری ہوئے اللهم اهد قومی فانهم لایعلمون (خدایا میری قوم کو ہدایت عطا فرما کیونکہ یہ لوگ حقیقت الامر سے بے خبر ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کو یہ ارشاد فرمایا اردت ان تسبق المقربین فصل من قطعك واعط من حرمك واعف عمن ظلمك یعنی اگر تو یہ چاہتا ہے کہ مقربین بارگاہ سے آگے بڑھ جائے تو اس شخص سے جو تجھ سے علیحدہ ہوتا ہے مل اور جو تجھے محروم رکھتا ہے اسے دے اور جو شخص تجھ پر تعدی کرتا ہے اسے معاف کر دے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شرط محبت یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کی جفا پر مقام وفا میں ثابت قدم رہے چنانچہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت مروی ہے کہ ایک دفعہ چند آدمی مل کر آپ کے پاس حاضر ہوئے شبلی اس وقت دیوانستان میں بیٹھے تھے آپ نے پوچھا کہ تم لوگ کون ہو انہوں نے جواب دیا کہ

ہم آپ کے محبین ہیں آپ نے ڈھیلے اور پتھر اٹھا کر نہیں مارنا شروع کیے وہ لوگ یہ سلوک دیکھ کر بھاگ نکلے آپ نے فرمایا کہ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو میری تکلیف سے کبھی اعراض نہ کرتے۔

بعض اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ ودود وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کے نزدیک اپنی معرفت کی وجہ سے اور اہل معصیت کے نزدیک اپنی غفور رحمت کی وجہ سے اور عوام کے نزدیک روزی اور کفایت امور کی وجہ سے محبوب سمجھا جائے اور بعض نے لکھا ہے کہ ودود وہ ذات ہے جو محبت کی وجہ سے اپنے محب کو اغیار سے الگ تھلگ کر لے اور رسوم و آثار بشریت کے ملاحظہ سے ہٹا لے۔

خاصیت

اگر کھانے پر ایک ہزار بار پڑھ کر بی بی کے ساتھ کھاوے تو وہ محبت اور فرمانبردار ہو جاوے۔

دعاء

اللهم ذا الحبل الشديد والامر الرشيد اسالك الامن يوم الوعيد والجنة يوم الخلود مع المقربين الشهود الركع السجود الموفين بالعهود انك رحيم ودود وانك تفعل ماتريد. (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمَجِیْدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ ذُوالْعَرْشِ الْمَجِیْدُ اس اسم کا صرفی وزن فعیل ہے اس لئے مجید اور ماجد میں وہی فرق ہے جو علیم اور عالم میں یعنی وضع فعیل میں بہ نسبت وضع فاعل کے مبالغہ مد نظر ہے مگر مجد کی تعبیر میں دو قول بیان کیا کرتے ہیں اول یہ کہ مجد کے معنے شرف کامل کے ہیں اور یہی معنے ماخوذ ہیں آیت قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدُ میں سو اس معنی کی رو سے مجد و شرافت اور علو و عظمت کی مستحق صرف وہی ذات اقدس ہے اس تعبیر کی رو سے اسم مجید اسم عظیم کا مترادف سمجھنا چاہیے۔

دوم لفظ مجد لغوی معنی کی رو سے وسعت کے مفہوم پر مشتمل ہے چنانچہ رجل ماجد ایسے شخص کو بولتے ہیں جو غنی اور کثیر الاحسان ہو اہل زبان بولتے ہیں مجدت الدابۃ اذا اعلفتہا حتی بطنہا یعنی پیٹ بھر کر چارہ کھلایا اور قرآن (کلام الٰہی) کو مجید بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے کیونکہ وہ کثیر الفوائد ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذات باری کو مجید اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ ذات اقدس کثیر الاحسان و افضال ہے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ جب اسم مجید کو اسماء ذات باری

شمار کیا گیا تو پھر ماجد کو بلحاظ وصف کے مجید سے کم درجہ پر ہے کیوں شمار کیا گیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اسم ماجد اسم واجد کے بعد ذکر کیا گیا ہے جس کے معنی غنی کے ہیں اس لئے لفظ ماجد بطور تاکید لایا گیا ہے یعنی وہ ذات غنی ہونے کے ساتھ کثیر الاحسان بھی ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ مجید وہ ذات ہے جو بلند عزت اور جمیل الافعال ہو امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسم مجید اسماء جلیل وہاب کریم کے مجموع مفہوم پر مشتمل ہے واللہ اعلم بالصواب۔

خاصیت

اگر مبرص ایام بیض میں روزہ رکھے اور ہر روز افطار کے وقت اس کو بکثرت پڑھے ان شاء اللہ تعالیٰ اچھا ہو جاوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْبَاعِثُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ لغت میں بعث کے معنی ہیں کسی چیز کو ابھارنے اور اٹھانے کے یقال بعث الناقۃ علی الیسر یعنی اونٹنی کو سیر پر ابھارا اس اسم کی تشریح میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مخلوق کو قبروں سے اٹھائے گا قال اللہ تعالیٰ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ انبیاء اور رسل کو اغراض ہدایت خلقت کی طرف مبعوث فرماتا ہے قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِہٖ رُسُلاً اِلٰی قَوْمِہِمْ سوم یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں مختلف ارادوں کو پیدا کر کے انہیں خاص خاص افعال پر لگاتا ہے چہارم کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو عجز کی حالت میں استمداد پر اور گناہ کے بعد توبہ کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعث سے نشاء آخرت یعنی بعد الموت کی حیات مراد ہے اور اسم باعث کی حقیقت کا سمجھنا موقوف ہے حقیقت بعث کی معرفت پر اور حقیقت بعث کی معرفت ایک ایسا دقیق اور اصعب امر ہے کہ جس کے ادراک سے افہام عاجز ہیں اور اکثر لوگ اس بارے میں محض

توہمات و تخیلات کے تابع ہیں اور زیادہ سے زیادہ وہ اس امر کا تخیل رکھتے کہ موت عدم ہے اور بعث بعد العدم ایک نئی پیدائش کا نام ہے۔ بعینہ پہلی پیدائش کی طرح سو یہ امر کہ موت عدم ہے غلط ہے کیونکہ جناب رسول کریم صلعم نے فرمایا کہ قبر جہنم کے گڑھوں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغوں سے ایک باغ ہے اور مرے ہوئے لوگ یا تو اہل سعادت ہوتے ہیں جو در حقیقت مردہ نہیں ہوتے قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّہِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَا اٰتَاہُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قتل کئے گئے ہیں انہیں مرے ہوئے مت سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے پاس روزی دیئے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر خوش زندگی کے مالک ہیں یا اہل شقاوت ہوتے ہیں اور یہ لوگ بھی مردہ نہیں ہوتے چنانچہ غزوہ بدر کے موقع پر جب مشرکین کو ہلاک کر کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تھا تو جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین کو یوں خطاب فرمایا انی وجدت ما وعدنی ربی حقاً فہل وجدتم ربکم حقاً یعنی میرے پروردگار نے مجھ سے وعدہ کیا تھا میں نے تو اس کو سچ پالیا ہے تم لوگوں نے بھی اپنے پروردگار کے وعدہ کو سچ پالیا ہے اس پر آپ سے سوال کیا گیا کہ آپ مردوں کو کیسے خطاب فرماتے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا ما انتم باسمع لما اقول منہم لکنہم لا یقدرون ان یجیبوا یعنی تم لوگ میری بات کو ان مقتولین سے زیادہ نہیں سن سکتے تم میں اور ان میں فرق صرف یہ ہے کہ یہ لوگ جواب کی قدرت نہیں رکھتے

(منکرین سماع موتی نے جو بات اس حدیث کے متعلق دیئے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کی طرف کچھ توجہ کی جائے منکرین کے معتمد علیہ اور بڑے ثقہ شیخ ابن تیمیہ اپنے مجموعہ رسائل میں اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم کتاب الروح میں سماع موتی کے بڑے زور سے قائل ہیں اور حدیث عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جواب دیتے ہیں)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اکابر اصحاب مکاشفہ اور ارباب مشاہدہ اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ انسان دوام حیات کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس پر فنا کا طاری ہونا محال ہے کیونکہ موت صرف عدم تصرف یعنی قویٰ اور اعضاء کے معطل ہو جانے کا نام ہے۔

رہا یہ امر کہ ایجاد ثانی ایجاد اول کی طرح ہو گا سو یہ بھی صحیح نہیں بلکہ ایجاد ثانی کو ایجاد اول سے کوئی مناسبت نہیں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ صرف یہی دو دفعہ کا ایجاد نہیں بلکہ ہستی انسان کے لئے کئی ایک ایجاد ہیں قال اللہ تعالیٰ وَيُنْشِئَكُمْ فِيمَا لَا تَعْلَمُونَ اسی طرح انسان ہستی کے مختلف مراتب پیدائش کو نطفہ علقہ مضغہ کے بیان کرنے کے بعد فرمایا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ اس جملہ میں خلقاً آخر (ایک اور نئی پیدائش) سے مراد انسانی ہستی کی وہ حالت مراد ہے جب مضغہ کے ساتھ روح جیسی شریف و نفیس حقیقت کو تعلق پیدا ہوتا ہے چونکہ یہ حالت ایک نہایت گرامی اور عظیم الشان تھی اس لئے اس کے بیان کرنے کے بعد فرمایا فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ اس پیدائش کے بعد ادراکات حسیہ کا پیدا کرنا ایک علیحدہ ہستی ہے پھر قوت ممیزہ کا قریباً سات سال کے بعد پیدا کرنا ایک نئی ہستی ہے پھر قوت عاقلہ کا قریباً پندرہ سال کی عمر کے بعد پیدا کرنا ایک نئی پیدائش ہے علیٰ ہذا القیاس بلوغ کی حالتیں بھی علیحدہ علیحدہ نئی پیدائش کہلاتی ہیں یہی معنی ہیں آیت وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا پھر کمال خلقت انسانی کے بعد خاص خاص افراد کے لیے روحانی کمالات ولایت و نبوت کے حاصل ہونے پر ایک نئی پیدائش کا آغاز ہوتا ہے اور اس لئے ان کمالات سے متصف ہونا گویا ایک قسم کا بعث ہے اسی خیال پر انبیاء علیہم السلام کے مامور ہونے کو بعثت کہا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ باعث ہے چنانچہ فرمایا هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ الآیۃ اور بعثت رسل اللہ تعالیٰ کا ویسا ہی ایک فعل ہے جیسا بعث بعد الموت مگر جس طرح حصول قوۃ عاقلہ سے پہلے عجائبات عقل کا ادراک کرنا دشوار ہے اسی طرح طور عقل کا پیدا ہو کر کمالات ولایت و نبوت

کی حقیقت کا کوئی شخص ادراک نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ جو شخص جس طور میں زندہ ہوتا ہے وہ اس سے اگلے طور کی حقیقت کا انکار کر دیا کرتا ہے چنانچہ مادہ پرست لوگ عموماً عجائبات روح کا انکار کر دیا کرتے ہیں بلکہ بعث بعد الموت کا انکار بھی صرف اسی خیال پر مبنی ہے سو جس طرح ایک طور ہستی کے ادراکات کسی آئندہ دوسرے طور سے بالکل علیحدہ ہوتے ہیں اور ہر دور میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی اسی طرح ایجاد بعد الموت یعنی ایجاد ثانی کو ایجاد اول سے کوئی مناسبت نہیں ہاں اشتراک رسمی کی رو سے ہر دو ایک ہیں مگر حقیقت ہر دو کی علیحدہ علیحدہ ہے یہ مسئلہ جائے خود بہت سے دقیق اور عمیق مباحث پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس موقع پر خارج از آہنگ ہے۔

انسان کامل کو اس سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کی صورت تفصیلی یوں ہے کہ جب انسان پہلے پیدا ہوتا ہے تو ہر ایک قسم کے ادراکات سے خالی ہوتا ہے جوں جوں مختلف اطوار میں منقلب ہوتا ہے اس کے ادراکات میں ترقی ہوتی جاتی ہے اس لئے قبل از حصول علوم روحانی پہلو میں وہ مردہ شمار کیا جاتا ہے اور جوں جوں علوم حقہ کو زیادہ حاصل کرتا ہے حیات طیبہ کا مالک بنتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جہل موت ہے اور علم حیات اور یہ معنی قرآن مجید سے ماخوذ ہیں قال اللہ تعالیٰ أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا الآیۃ (الناس موتی واھل العلم احیاء)

سو جس طرح بدن بلا روح زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح روح بلا علم مردہ ہے اس لئے جو شخص علوم حقہ کی طرف رجوع کرتا ہے وہ ایک نئی پیدائش میں منقلب ہوتا ہے اور جب دوسروں کو جہالت سے نکال کر معارف و حقائق کی طرف متوجہ کرتا ہے تو گویا مردہ روحوں کو زندہ کرتا ہے اور اس لئے وہ اسم باعث کا مظہر کامل کہلاتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ باعث وہ ذات ہے جو اہل ہمت کی ہمتوں کو امور عالیہ کے اکتساب کی طرف متوجہ کرے اور قلب سے وساوس و

toobaa-elibrary.blogspot.com

شکوک کو مٹا دے بعض لکھتے ہیں کہ باعث وہ ذات ہے جو اسرار کو ہوس سے اور افعال کو میل کچیل سے پاک کر دے یعنی فعال بشر کو آثار بشریت سے صاف بنا دے حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ باطن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رہ کر روحانی بن جاؤ اور ظاہر میں خلقت کے ساتھ جسمانی زندگی بسر کرو۔

خاصیت

سوتے وقت سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس کو سو بار پڑھا کرے تو اس کا قلب علم و حکمت سے منور ہو

اَلشَّهِيْدُ

حل جمل ۵۱۴

قال اللہ تعالیٰ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور پھر فرمایا عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اسم شہید شاہد (اسم فاعل) کا مبالغہ ہے جیسے علیم بمعنی عالم اور قدیر بمعنی قادر اور اس کی تفسیر میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادہ ہے اور غیب سے مراد ہر ایک مخفی امر ہے اور شہادت سے مراد ہے ہر ایک امر جو ظاہر ہے یہ ظاہر و باطن محض انسانی علم کی رو سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ظاہر و باطن میں کوئی امتیاز نہیں جب نسبت علم ذات باری کی طرف عام طور پر کی جاتی ہے تو اسے خبیر کہتے ہیں اور جب امور خفیہ اور ظاہرہ ہر دو کو ملحوظ رکھ کر کی جاتی ہے تو اسے شہید بولتے ہیں دوم شہید بمعنی حاضر اور مشاہد بھی مستعمل ہے قال اللہ تعالیٰ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ سوم یہ کہ شہید بمعنی گواہ ہے جو اپنے بیان سے امر متنازع فیہ کے متعلق مدعی کی صداقت کا اظہار کرتا ہے چنانچہ آیت شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں لفظ شہادت اسی معنی میں ماخوذ ہے بعض مفسرین نے آیت مسطورہ بالا میں شہادت سے یہ مراد لی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اپنی توحید پر دلائل انفس و آفاق کو قائم کر دیا ہے چہارم شہید بمعنی مشہود لہ ہے یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ کے بندے اس کی توحید کا اقرار اور شہادت کا اشہد کرتے ہیں اس لئے وہ مشہود لہ ہے قال اللہ تعالیٰ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ آدمی بھی شہید کہلا سکتا ہے اور اس سے مراد ایسا شخص لیا کرتے ہیں جو معرکہ میں مشرکین کے ہاتھ سے قتل کیا جائے اس کی وجہ تسمیہ میں چند اقوال ہیں اول یہ کہ ملائکۃ الرحمن حاضر ہوتے اور اس کی روح کو منازل قدس میں لے جاتے ہیں اس لئے شہید بمعنی مشہود ہوا دوم یہ کہ شہید بمعنی شاہد ہے یعنی ایسا شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے لطف اور اس کی رحمت کا مشاہدہ کر لیا ہو تا ہے سوم نظر بن شمیل کہتے ہیں کہ شہید بمعنی حی زندہ ہے کیونکہ زندہ ہی حالات کا مشاہدہ کر سکتا ہے اور شہید مقتول ہونے کے بعد زندہ رہتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ چہارم یہ کہ شہید بمعنی حاضر ہے یعنی ایسا شخص جو میدان جنگ میں حاضر ہوتا ہے پنجم یہ کہ قیامت کے دن بجملہ ان لوگوں کے ہوگا جو گذشتہ امتوں پر شاہد گذریں گے قال اللہ تعالیٰ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ اس امر کو بھی خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ذات باری کا شہید ہونا اولیاء کے لئے تو موجب طرب ہے اور اعداء کے لئے باعث خوف موجب طرب ہونے کے لئے اس واقعہ میں غور کرو کہ جب ایک شخص کو کسی حاکم جبار کی طرف سے تازیانہ لگائے جا رہے تھے تو ایک بزرگ نے اسے کہا کہ الم ضرب پر تمہارے جزع نہ کرنے کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ میں اپنے محبوب کی خاطر پٹ رہا ہوں اور وہ میری اس حالت کو دیکھ رہا ہے بس صرف اسی خیال نے الم ضرب کو مجھ پر آسان کر دیا ہے سو جب ایک مخلوق کی نظر محبت پر الم ضرب کو آسان کر دیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر بندہ پر طاعت کو کیسے آسان نہ کر دے گی قال اللہ تعالیٰ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا یعنی اپنے پروردگار کے حکم پر جمے رہو کیونکہ تم ہماری حفاظت (نگرانی) میں ہو ظاہر ہے کہ اس جملہ میں حضور

علیہ السلام کو ایک اعلیٰ درجہ کی تسلی دی گئی اور یہی تسلی تویت کفار کو حضور علیہ السلام پر آسان کر دیا کرتی تھی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے اعداء (مشرکین و کفار) کے حق میں موجب خوف ہونے کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ شرک و معصیت موجب سوء ادب ہیں اور سوء ادب بندہ کو مستوجب عذاب بنا دیتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ شہید وہ ذات ہے جو اسرار محبین کی حفاظت کرے اور ہر ایک حال میں ان سے قریب ہو بعض لکھتے ہیں کہ یہ وہ ذات ہے جو قلوب کو اپنے مشاہدہ سے منور فرمائے اور بعض نے یوں توجیہ کی ہے کہ شہید وہ ذات ہے جو دنیا اور آخرت میں اپنے بندہ کے باطن اور اس کی مناجات سے آگاہ ہو اور بعض نے یوں تعبیر کی ہے کہ شہید وہ ذات ہے جو اپنے محب کے حق میں بہترین جلیس ہو اور اس کے ہوتے ہوئے کسی انیس و ہمدم کی ضرورت نہ ہو۔

انیس خلوت شب زندہ داراں
رفیق روز در محنت گذاراں

خاصیت

اگر با فرمان تولادیا فی کی پیشانی پکڑ کر اس کو پڑھے یا ہزار بار پڑھ کر دم کرے وہ فرمانبردار ہو جائیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْحَقُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰہِ مَوْلٰھُمُ الْحَقِّ اور پھر فرمایا ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَاتَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہِ الْبَاطِلُ لفظ حق مشتق ہے حق یحق الذالثبت سے یہی وجہ ہے کہ حق امر موجود کو بولتے ہیں اور باطل امر معدوم کو چونکہ اشیاء اپنے اضداد سے ظاہر ہوتی ہے اس لئے ہر ایک شے جس کی بابت کسی قسم کی خبر دی جاتی ہے یا تو حق مطلق ہو گی یا باطل مطلق یا من وجہ حق ہو گی اور من وجہ باطل سو حق مطلق تو واجب بذاتہ کو کہتے ہیں اور باطل مطلق ممتنع بذاتہ کو اور من وجہ حق اور من وجہ باطل ممکن بذاتہ کو بولتے ہیں ممکن بذاتہ اپنے وجود میں کسی موجد کا محتاج ہوتا ہے چونکہ تمام موجودات بجز ذات باری کے موجد کی محتاج ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ایجاد موجد پر وجود پذیر ہو ورنہ حیز عدم سے نکل کر کبھی دائرہ وجود میں نہیں آسکتی چنانچہ آیت کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ میں اسی حقیقت امکانیہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسی خیال پر اہل حقیقت بولا کرتے ہیں لا موجود فی الحقیقۃ الا اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ واجب الوجود حقیقی بجز ذات باری کے کوئی موجود

نہیں وہی ازل سے ابد تک موجود ہے اس لئے جب کوئی چیز وجود پذیر ہوتی ہے تو اسی ذات مقدس کے ایجاد سے موجود ہوتی ہے سو وہی ذات حق مطلق ہے جو اور اشیاء کو حق بناتی ہے قال اللہ تعالیٰ وَیُحِقُّ اللّٰہُ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِہٖ چونکہ ذات باری حق ہے اس لئے جس طرح اس کا وجود ازلی و ابدی ہے اسی طرح اس کے وجود کا اعتقاد اور اس کے صفات کاملہ کا اقرار بھی حق ہے جو ازلاً و ابداً قائم اور بے زوال ہے۔ کیونکہ جب اس ذات مطلق کو فنا نہیں تو اس کے صفات کاملہ اور اس کے اعتقاد و اقرار پر بھی زوال کا عائد ہونا ناممکن ہے پس وہی ذات حق ہے اور اسی کی معرفت (اعتقاد) الحق المعارف ہے اور اسی کے صفات کاملہ کا قائل ہونا (اقرار) الحق الاقوال ہے اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَاءِ سے تعبیر کیا گیا ہے اور وہ کلمہ طیبہ جس کی وصف ان الفاظ میں کی گئی ہے کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کیونکہ اسی سے اس ذات مطلق کے موجود حقیقی ہونے اور اس کے صفات کاملہ کے اعتقاد اور اقرار کی ضرورت کا علم حاصل ہوتا ہے۔

تنبیہ

کتب سیر میں لکھا ہے کہ حسین بن منصور حلاج نے انا الحق پکارا تھا جس پر علمائے وقت نے اسے واجب القتل قرار دیا چونکہ اس امر کے فہم حقیقت میں بسا اوقات لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے لہذا مختصراً اس کے متعلق حل کرنا مفید معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر خوب یاد رکھنا چاہیے کہ واجب کبھی ممکن نہیں ہو سکتا اور نہ ممکن کبھی واجب ہو سکتا ہے اس لئے عبد عاجز خواہ کسی مقام عرفان تک ترقی کر جائے پھر بھی عبد ہی رہتا ہے اور یہ کہنا کہ عبد فانی ہو کر اپنی حقیقت امکانیہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے اور واجب بالذات کا مقام حاصل کر لیتا ہے جس کو اصطلاح میں اتحاد کہتے ہیں کفر صریح ہے کیونکہ اگر ہر دو شے باوجود اتحاد کے باقی رہیں تو اتحاد ثابت نہ ہو گا اور اگر ہر دو فانی ہو جائیں تو ایک تیسری شے موجود ہو گی اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

اگر ایک باقی ہے اور دوسری فانی ہو جاوے تو اتحاد ناممکن ہے کیونکہ کوئی موجود عین معدوم نہیں ہو سکتا سو جب تینوں صورتیں باطل ہیں تو اب دیکھنا ہے کہ کوئی صحیح تاویل جملہ انا الحق کی ممکن ہو سکتی ہے یا نہیں اہل معرفت نے اس کی مختلف تاویلات کی ہیں مگر قوی تاویل یہ ہے کہ قائل کو مقام فنا کلی حاصل ہو چکا تھا جہاں اپنے نفس کا شعور اور اس عدم شعور کا شعور بھی نہیں ہوتا یعنی انوار جلال کا اسقدر غلبہ ہو جاتا ہے کہ عارف کو استغراق کلی اور محویت مطلق کی حالت میں بجز ذات واحد حقیقی کے کسی غیر کا مشاہدہ نہیں ہوتا اور اس لئے ذات احدیت کی طرف ایسے کلمات عارف کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں گویا ذات باری ہی اپنے تئیں انا الحق کہہ کر پکارتی ہے نہ یہ کہ وہ عبد حقیر انا سے اپنی ذات مراد لیتا ہے کیونکہ اسے تو اپنی ذات کا شعور ہی نہیں ہوتا اور ایسی بے شعوری میں وہ اس قسم کے کلمات زبان پر لاتا ہے کما قیل انا من اھوی ومن اھوی انا

انسان کامل کو اس اسم سے یہ حظ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو باطل خیال کرتا ہے اور سوا ذات باری کے کسی موجود کو حق نہیں جانتا چونکہ حق مطلق وہی ذات مقدس ہے اس لئے اس کی معرفت اور عقائد صحیحہ بھی جو شریعت میں وارد ہو چکے ہیں حق ہیں۔

اہل تصوف عموماً اسم حق کا استعمال کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص مقام مکاشفہ میں ہوتا ہے اسے ماسوی اللہ سب باطل نظر آتے ہیں برخلاف اس کے متکلمین اسم باری کا استعمال کرتے ہیں کیونکہ وہ مقام استدلال میں ہوتے ہیں یعنی مخلوق سے خالق کے اثبات پر استدلال کرتے ہیں۔

خاصیت

ایک مربع کاغذ کے چاروں گوشوں میں لکھ کر اس کو ہتھیلی پر رکھ کر آخر شب میں آسمان کی طرف بلند کرے تو مہمات کو کفایت ہو۔

اَلْوَکِیْلُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلاً اور پھر فرمایا لَاتَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلاً یہ اسم مصدر وکالت سے مشتق ہے یقال وکل الیہ الامر وکلاً وکولاً کابدہ گذاشت و سپرد بدوئے ووکل باللہ وکلا تکیہ نمود برخدا اعتراف کرد بجز خود وکیل وزن صرفی میں فعیل ہے جو بمعنی مفعول یعنی موکول مستعمل ہے اور مراد اس سے موکول الیہ ہے یعنی وہ ذات جس پر بندے اپنے مصالح امور کو سپرد کر کے اعتماد کرتے ہیں اور وہ ان کے امور کی متکفل ہو جاتی ہے اس تعبیر کی توجیہ یہ ہے کہ مصالح امور کو کسی غیر کی تحویل و تفویض میں دینا دو شرطوں سے مشروط ہے اول یہ کہ موکل خود اس امر کو سر انجام دینے سے عاجز ہو اور مخلوق کا اپنے مصالح امور کی سر انجام دہی سے عاجز ہونا ظاہر ہے دوم موکول الیہ (وکیل) کمال علم اور کمال قدرت اور کمال رحمت اور کمال استغناء سے موصوف ہو کیونکہ ان صفات کے عدم کی صورت میں وکیل سر انجام دہی سے عاجز ہوگا یا خود غرض یعنی جہل بجز عدم شفقت و احتیاج ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے موکول الیہ ہرگز وکالت کے قابل نہیں ہو سکتا اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

جب یہ چاروں صفات بدرجہ کمال اسے حاصل ہوں تو مصالح امور کی تفویض کے لئے وہ موزوں ہو سکتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو یہ صفات بدرجہ کمال حاصل نہیں اس لئے وکیل ہونا بھی اسی ذات اقدس کا منصب ہے چنانچہ آیت وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ میں ان ہی صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے چونکہ کوئی مخلوق ان صفات کا اہل نہیں ہو سکتا اس لئے اسباب ظاہری کی پابندی کرنا بطور عادۃ اللہ کے منافی توکل نہیں ہاں اسباب کو موثر جاننا عین شرک ہے جو لوگ حقیقت توحید سے آگاہ ہیں وہ اسباب کو نظر انداز کر کے سبب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور مشیت ازلی کو بلاواسطہ موثر دیکھتے ہیں جس قدر کوئی شخص اس حقیقت سے زیادہ آگاہ ہوتا ہے اسی قدر حوادث خیر و شر سے کم متاثر ہوتا ہے الغرض حقیقت توکل پر مطلع ہونا سخت دشوار امر ہے اہل تعلق کو یہ پایہ نصیب نہیں بلکہ ان کے پاس مقام توکل کا ذکر کرنا انہیں حقیقت توحید سے نفرت دلانا ہے آیت رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا کے معنی میں غور کرو کہ کس طرح اس ذات اقدس نے الفاظ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ سے اپنا متصرف کل ہونا ظاہر فرما کر جملہ لا الہ الا ھو سے اپنی توحید کا پتہ دیا ہے اور پھر حرف فاء سے جو معنی تفریع پر مضمن ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ جب موثر حقیقی وہ ذات بے ہمتا ہے تو بجز اس کے کسی غیر کی طرف مصالح امور میں رجوع کرنا منافی توحید ہے اسی کو ہر حال میں پنا متکفل اور نگران حال سمجھو مگر یہ مقام بجز عارف کامل کے جو رسوم اہل ظاہر سے آزاد ہو چکا ہے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ اس حقیقت کے حصر الفہم ہونے کی طرف حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا لو توکلتم علی اللہ حق توکلہ لرزقکم کما یرزق الطیر تغدوا خماصاً و تروح بطاناً یعنی اگر تمہیں حقیقت توکل کا کماحقہ پایہ نصیب ہوتا تو تمہیں اسی طرح روزی دی جاتی جس طرح پرندوں کو دی جاتی ہے جو صبح سویرے اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام پیٹ بھرے واپس آتے ہیں یعنی وہ تمہاری طرح نہ تو بلی

جوتتے ہیں نہ محنت کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ انہیں ہر روز کا قوت پہنچا دیتا ہے۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ وکیل وہ ذات ہے جو پہلے اپنے بندہ کو رجوع الی الغیر سے کافی ہو کر اس کے لئے نگران حال ہو اور بالآخر سے اپنی ولایت کے مقام تک ترقی دے۔

خاصیت

ہر حاجت کے لئے اس کی کثرت مفید ہے۔

دعاء

حسبی اللہ ونعم الوکیل (حصن حصین)

اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید انک الرب وحدک لا شریک لک اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید ان محمد اصلی اللہ علیہ وسلم عبدک و رسولک اللھم ربنا ورب کل شئی انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ اللھم ربنا ورب کل شئی اجعلنی مخلصاً لک واھلی فی کل ساعۃ فی الدنیا والا خرۃ یا الجلال والا کرام اسمع واستجب اللہ الا کبرا لا کبر حسبی اللہ ونعم الوکیل اللہ اکبر الاکبر۔ (حصن حصین)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْقَوِیُّ الْمَتِیْنُ

جل جلالہ جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ ذُوالْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ یہ ہر دو اسم علیحدہ علیحدہ قوت اور متانت سے مشتق ہیں قوت سے تو قدرت کاملہ مراد ہے اور متانت سے شدت قوت چونکہ قوت کسی چیز کی اس کمال کا نام ہے جس سے وہ دیگر اشیاء میں موثر ہو اور خود وہ کسی دوسری چیز سے اثر پذیر نہ ہو اس لئے ذات باری کے قوی ہونے کی توجیہ یوں ہو گی کہ قوی وہ ذات واجب الوجود ہے جو ممکنات میں حسب ارادہ موثر ہے کیونکہ وہی ایجاد اور تغیر و انقلاب کا مالک ہے اور خود کسی چیز سے کسی قسم کا اثر قبول نہیں کر سکتا اسی طرح اسم متین کی توجیہ ہو سکتی ہے کیونکہ متانت کے معنی صلابت کے ہیں اور صلابت کسی چیز کی شدت کو بولتے ہیں متن بمعنی پشت ہی سے مشتق ہے اور اسی وجہ سے ظہر بمعنی قوت مستعمل ہے قال اللہ تعالیٰ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا ویقال کلام متین اذا کان قویاً

لفظ قوت بلوغ القدرۃ کا افادہ کرتا ہے اور متانت شدت قوت اور ہر دو میں اعتباری فرق ہے اور انسان کامل کو ان ہر دو اسم سے یہ حظ حاصل ہوتا ہے

کہ وہ اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے ماسوی اللہ کی طرف ملتفت نہیں ہوتا اور کم از کم اس کا رتبہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے نفس کے مقتضا پر غالب آتا ہے اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ جو شخص قوت ذات باری کو جان لیتا ہے وہ اپنے عزم سے دست بردار ہو جاتا ہے۔

خاصیت

القوی

اگر کم ہمت پڑھے ہمت ہو جاوے اگر کمزور پڑھے زور آور ہو اگر مظلوم اپنے ظالم کے مغلوب کرنے کو پڑھے وہ مغلوب ہو جاوے۔

المتین

مثل خواص القوی کے ہے اور اگر کسی فاجر مرد یا عورت پر پڑھا جاوے تو فجور سے باز آوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْوَلِیُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اور پھر فرمایا اَنْتَ وَلِیّٰ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اسم مولیٰ بھی بمعنی ولی مستعمل ہوتا ہے چنانچہ مختلف آیات میں اس کا استعمال آچکا ہے۔

واضح ہو کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ اہل ایمان کا ولی ہے اسی طرح اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے اولیاء کہلاتے ہیں چنانچہ فرمایا اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ اور اس اسم کی توجیہ میں چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ ولی بمعنی متولی ہے اور متولی اس شخص کو بولتے ہیں جو کسی امر کی نگہداشت اور سر انجام دہی کا متکفل ہو چنانچہ ولی الیتیم اس شخص کو بولتے ہیں جو یتیم کے نیک و بد حالات کا نگران اور اس کی اصلاح کا ذمہ دار ہوتا ہے اور ولی المرأۃ وہ شخص ہوتا ہے جو عورت کے عقد نکاح کا مجاز اور متکفل ہو دوم یہ کہ ولی بمعنی ناصر و یاور کے ہے چنانچہ اولیاء السلطان ان اشخاص کو بولتے ہیں جو اس کے اعوان و انصار ہوں قال اللہ تعالیٰ نَحْنُ اَوْلِیَآءُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ای انصارکم معنی اول کے رو سے اس اسم کے معنی کافر اور مومن ہر دو کو شامل ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام

مخلوقات کے امور کا ولی ہے اور معنی ثانی کی رو سے اس کے معنی صرف اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں سوم یہ کہ ولی بمعنی محب ہے چہارم یہ کہ ولی بمعنی موالی ہے جیسے جلیس بمعنی مجالس اور موالات کے معنی باہم دوستی کرنے کے ہیں اہل لغت لکھتے ہیں کہ ولی کے معنی قریب کے ہیں کیونکہ ولی بروزن غنی مشتق ہے ولی یلی سے جس کے معنی قرب کے ہیں اس لئے لفظ ولی کے جو معنی لئے جائیں گے ان میں اپنے ماخذ کے رو سے معنی قریب کا مفہوم ضرور ملحوظ ہو گا چنانچہ ذات باری بندوں سے اس قدر قریب ہے کہ کوئی اور چیز اس سے زیادہ قریب نہیں ہو سکتی اور اس قرب کا ذکر آیت نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ میں محض بطور تفہیم ذکر کیا گیا ہے ورنہ ذات باری کے قرب کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ ولی وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کی نصرت اور اعداء کی ذلت کرے یعنی اس کا ولی منصور اور عدو مقہور رہتا ہے بعض لکھتے ہیں کہ ولی وہ ذات ہے جو بلا علت اپنے اولیاء سے محبت رکھے اور ارتکاب ذلت پر اپنی بارگاہ سے رد نہ کرے بعض لکھتے ہیں کہ ولی اس ذات کو بولتے ہیں جو سیاست نفوس اور تہذیب قلوب کی والی ہو بعض لکھتے ہیں کہ ولی احسان کا کامل اور وعدہ کے وفا کنندہ کو کہتے ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندوں میں سے وہ شخص ولی کہلا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے اولیاء سے محبت رکھتا اور ان کی نصرت کرتا ہو اور اعداء اللہ سے عداوت رکھتا ہو نفس و شیطان بھی منجملہ اعداء اللہ کے ہیں جن سے عداوت اور مخالفت برتنا ولی اللہ کا فرض ہے۔

خاصیت

جو بکثرت اس کو پڑھے محبوب ہو جاوے اور جس کو کوئی مشکل پیش آوے شب جمعہ میں ہزار بار پڑھے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْحَمِیْدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ حمید یا تو فعیل بمعنیٰ فاعل یعنی حامد ہے کیونکہ وہ ذات اقدس ازل سے خود اپنی حمد کی مالک ہے چنانچہ فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ یا فعیل بمعنی مفعول یعنی محمود ہے کیونکہ وہ خود اپنے حمد کا مالک ہے اور اس کے بندے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اس لئے وہ ذات اقدس محمود ہے اصل نے لکھا ہے کہ حمید وہ ذات ہے جو مستحق حمد و ثنا ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کے عقائد شبہات سے اور اس کے اعمال شہوات سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ حمید وہ ذات ہے جو خیرات کی توفیق عطا فرما کر ان پر حمد کے اور گناہوں کو محو کر کے ان کی یاد دلانے سے باز نہ کرے۔

تنبیہ

عوام الناس تو جسمانی لذات کے حصول پر حمد کیا کرتے ہیں اور خواص

انعامات روحانی کے موصول ہونے پر مگر مقربین بارگاہ صرف اس لئے حمد کیا کرتے ہیں کہ حمد کا استحقاق بجز ذات باری کے کسی غیر کو حاصل نہیں سو حمید مطلق بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں اور عباد اللہ میں سے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سزاوار حمد ہیں کیونکہ آپ کے کمالات و فضائل کا حصر ناممکن ہے پھر دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام اور پھر عامہ اولیاء اللہ رضی اللہ عنہم۔

خاصیت

اس کی کثرت سے اخلاق و افعال و اقوال حمیدہ حاصل ہوں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُحْصِیُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَداً مصدر احصاء سے مشتق ہے جس کے معنی شمار کرنے اور نگاہ رکھنے کے ہیں احصاء در حقیقت وصف علم ہی کا نام ہے جبکہ معلومات کے شمار اور احاطہ کا مفہوم علم میں محفوظ رکھا جائے۔

محصی مطلق بجز ذات باری کے کوئی موجود نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی افراد موجودات اور ان کے حرکات و سکنات کا علم رکھتا ہے اور وہی قیامت کے دن بندوں کے اعمال کا حساب لے گا قال اللہ تعالیٰ اَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے محصی ہونے کا یقین کر لیتا ہے تو وہ اپنے تمام اعمال نفس کی نگہداشت کرتا ہے۔ حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ محصی وہ ذات ہے جو ظاہر پر بینا اور باطن پر آگاہ ہو بعض لکھتے ہیں کہ وہ ذات جو اپنے بندہ کے اعداد طاعات کی حافظ اور اس کے جمیع حالات سے آگاہ ہو۔

خاصیت

اگر روٹی کے بیس ٹکڑوں پر بیس بار پڑھے تو خلقت مسخر ہو۔

اَلْمُبْدِیُ الْمُعِیْدُ

جل جلالہ جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَیُعِیْدُ ابداء کے معنی ہیں از سر نو کسی چیز کا وجود میں لانا اور اعادہ کے معنی کسی چیز کے لوٹانے کے ہیں اصل میں ابداء اور اعادہ ہر دو بمعنی ایجاد کے ہیں فرق یہ ہے کہ ایجاد اگر از سر نو ہو تو اسے ابداء کہتے ہیں اور اگر پہلے کوئی چیز فانی ہو کر پھر وجود میں لائی جاوے تو اسے اعادہ کہیں گے اس تعبیر کے مطابق ان ہر دو اسم کی توجیہ یہ ہو گی کہ وہی ذات اقدس مخلوقات کو از سر نو عدم سے وجود میں لانے والی ہے اور وہی عدم میں لے جا کر پھر ان کو عرصہ محشر میں اکٹھا کرے گی اور اسی اکٹھا کرنے کو اعادہ کہا گیا ہے سو جس طرح اشیاء کا آغاز اسی سے ہے اور ان کا انجام بھی اسی کی طرف ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

خاصیت

المبدی

حاملہ کے بطن پر آخر شب میں پڑھے تو حمل محفوظ رہے اور ساقط نہ ہو۔

المعید

اگر کوئی بات بھول جاوے اور یاد کرنے سے یاد نہ آوے تو اس کو بار بار ذکر کرے خواہ تنہا یا مبدی کے ساتھ ان شاء اللہ تعالیٰ یاد آجاوے۔

اَلْمُحْیِ الْمُمِیْتُ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الَّذِیْ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ واضح ہو کہ حیات اور موت ہر دو کا خالق اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ فرمایا الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ اور موت و حیات کی ان کے موارد کے لحاظ سے مختلف صورتیں ہیں مثلاً وہی ذات باری نطفہ اور علقہ میں حیات کو پیدا کرتی ہے اور وہی ذات اقدس زمین مردہ کو باران رحمت سے حیات بخشتی ہے اور وہی قلوب غفلت زدہ کو اپنے ذکر سے زندہ کرتی ہے اور وہی ارواح سالکین کو انوار تجلیات سے حیات طیبہ عطا فرماتی ہے اور واصلین کو مقام مشاہدہ میں انعام جمال سے عزت بخشتی ہے قال اللہ تعالیٰ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ اور پھر فرمایا وَلَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ان آیات میں جسمانی حیات و ممات اور روحانی حیات و ممات ہر دو کا مفہوم داخل ہے۔

حضرات مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ محی وہ ذات ہے جو اپنے ذکر سے قلب کو زندہ کرے اور احسان سے مطیع بنائے اور شکر کی توفیق عطا فرمادے اور ممیت وہ ذات ہے جو قلب کو غفلت سے مردہ بنادے اور نور عقل پر ظلمت نفس

toobaa-elibrary.blogspot.com

کو غالب کر دے۔

خاصیت

الحی

جس کو کسی سے مفارقت کا اندیشہ ہو یا قید کا خوف ہو اس کو کثرت پڑھے۔

المیت

جس کو عادت اسراف کی ہو یا نفس طاعت پر آمادہ نہ ہوتا ہو تو اس کی کثرت کرے۔

اَلْحَیُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ حیات منبع فعل ادراک کا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے اسماء میں اسم حی کا ذکر اس لئے فرمایا ہے تاکہ اپنا حی لایموت ہونا ظاہر کرے کیونکہ ماسوائے اللہ جو حی ہے وہ مورد موت ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ اس لئے حی کامل بجز ذات باری کے اور کوئی موجود نہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی موجود اس کے اثر فعل اور ادراک سے خارج نہیں کیونکہ کمال حیات مقتضی کمال فعل و ادراک کا ہے اور ماسوائے اللہ جس قدر احیاء ہیں ان میں کمال حیات کے رو سے مدارج ہیں چنانچہ ان کے افعال اور وسعت ادراک سے اس امر کا خوبی پتہ لگتا ہے۔

انسان کامل کو وصف حیات سے جو بہرہ ہوتا ہے اس کا کمال معیار اس کے افعال و ادراک کی وسعت سمجھنی چاہیے اسی نکتہ پر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ میں شہداء کو احیاء کہا گیا ہے کیونکہ جہاد اللہ تعالیٰ کی محبت پر مبنی ہے اور محبت حیات قلب کا واسطہ ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

تنبیہ

قبل ازیں اسماء ذات باری کے توقیفی ہونے کا مسئلہ لکھا جا چکا ہے اسی مسئلہ کی بناء پر ذات باری کو حیوان نہیں کہہ سکتے ہیں۔

خاصیت

اس کی کثرت یا لکھ کر پینے سے ہر قسم کے امراض سے نجات ہو۔

دعاء

یا حی یا قیوم برحمتک استغیث (حصن حصین)

اَلْقَیُّوْمُ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ممکن اور واجب کے رو سے موجودات کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں یا تو تمام موجودات ممکن ہوں گی اور اس صورت میں ممکن کا بلا علت وجود میں آنا تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ ممکن کسی دوسرے ممکن کے وجود کے لئے علت نہیں ہو سکتا یا تمام موجودات واجب ہوں گی اس صورت میں موجودات کا تعین بھی علیحدہ علیحدہ ہو گا اور یہیں سے ہر ایک کا مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک سے ہر ایک مرکب ہونا لازم آئے گا اور ترکیب منافی وجوب ہے اس لئے تمام موجودات کا واجب ہونا بھی باطل ٹھہرا اب رہی تیسری صورت اور وہ یہ ہے کہ بعض موجود تو واجب ہو اور بعض ممکن اور یہی صورت صحیح بھی ہے یہ ضروری ہے کہ واجب صرف ایک ہی ذات ہو گی متعدد نہیں ہو سکتی کیونکہ واجب کو متعدد مان لینے کی صورت میں مذکورہ بالا قباحت لازم آئے گی یعنی کہ مابہ الامتیاز اور مابہ الاشتراک سے ہر دو کا مرکب ہونا جو منافی وجوب ہے اس لئے یقیناً تمام موجودات ممکنہ کا خالق صرف ایک ہی ذات ہو سکتی ہے اور وہ واجب ہی ہو گی اور باقی تمام موجودات ممکن جو بلحاظ مخلوق

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہونے کے ذات واجب کی طرف محتاج ہو گی چونکہ واجب کا ہر ایک جہت سے بے نیاز ہونا ضروری ہے اس لئے وہ ذات قائم بذاتہ ہونے کے علاوہ دیگر موجودات کے لئے سبب قیام بھی ہو گی مطلب یہ کہ جہاں وہ ذات سبب وجود ہے سبب قیام وجود بھی ہے چونکہ اسم حی فاعل مدرک کے مفہوم پر مشتمل ہے اور اسم قیوم قائم بذاتہ اور مقوم غیرہ کے مفہوم پر متضمن ہے اس لئے یہ ہر دو اسم علم توحید کے بے شمار مسائل ضروریہ کے لئے بمنزلہ اصول کے قرار دیئے گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر ایک موقع پر ان ہر دو کو ملا کر ذکر کیا کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ وصف قیومیت کے لئے چند ایک لوازم ہیں اول یہ کہ ذات واجب الوجود ایک ہی ہو گی نہ متعدد دوم یہ کہ وہ کسی محل میں متحیز نہ ہو سوم یہ کہ اس کو تمام موجودات کا علم بدرجہ کمال ہو چہارم تمام موجودات اپنے وجود اور قیام وجود میں اس کی محتاج ہو پنجم تمام امور و حوادث بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی طرف منسوب ہوں ان مذکورہ بالا لوازم میں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ تمام مسائل علم الٰہیات کے جن پر علم کلام میں بحث کی جاتی ہے انہیں ہر دو اسم پر مترتب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان اسماء اور ان آیات کی جن میں یہ واقع ہوئے ہیں فضیلت بدرجہ غایت تسلیم کی گئی ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اسم اعظم الحی القیوم ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے دن سجدہ میں دیر تک صرف یا حی یا قیوم پکارتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت سے اہل ایمان کی عزت افزائی کی۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ ماسوائے اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے ابویزید رحمتہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ توکل کی یہ حقیقت ہے کہ بندہ بجز ذات باری کے کسی کو اپنا ناصر و رازق نہ جانے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہی ذات قائم و قیوم ہے وہ تمام خلقت سے امید قطع کر لیتا ہے۔

خاصیت

اس کی کثرت سے نیند آتی ہے یا حی یا قیوم کو فجر سے طلوع تک پڑھنے سے مستعدی اور آمادگی طاعات میں حاصل ہو۔

دعاء

اللھم غارت النجوم وھدات العیون وانت حی قیوم لاتاخذک سنۃ ولا نوم یا حی یا قیوم اھدی لیلی وانم عینی (حصن حصین)

استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

الْوَاجِدُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں مذکور نہیں لیکن اسماء ذات باری میں بالاتفاق شمار کیا گیا ہے لغت عرب کی رو سے اس لفظ کا استعمال تین طرح ہوا کرتا ہے اول واجد بمعنی غنی یقال وجد فلان وجداً وجدۃ یعنی مالدار ہو گیا ایک حدیث میں وارد ہوا ہے لی الواجد ظلم یعنی تونگر کو کسی کا ادائے قرضہ میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے اگر اس اسم کو مادہ ج د سے مشتق سمجھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ واجد وہ ذات ہے جو اپنے ارادہ کے نافذ کرنے پر کامل قدرت رکھتی ہو۔

دوم واجد بمعنی عالم یقال وجدت فلاناً فقیہاً یعنی میں نے فلاں شخص کو فقیہ پایا اس صورت میں وجود سے مشتق ہو گا۔

سوم واجد بمعنی حزین مگر اس معنی میں ذات باری پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہاں وجد علیہ بمعنی غضب علیہ مستعمل ہے لہذا ذات باری کے متعلق اس کی توجیہ یہ ہو گی کہ واجد وہ ذات ہے جو کفار و فساق کو مغضوب علیہم بناتی ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ واجد (کسی چیز کا پانے والا) فاقد

(کسی چیز کا کھونے والا) کی ضد ہے اور پھر لکھتے ہیں کہ وہ ذات جو کسی غیر ضروری چیز کو کھوئے اسے فاقد نہیں کہہ سکتے اور نہ جس کے پاس کوئی غیر ضروری چیز موجود ہو اس کو واجد کہہ سکتے ہیں بلکہ واجد ایسی ذات کو کہنا چاہیے کہ جس کو ہر ایک چیز جو اس کے لئے ضروری ہے حاصل ہو سو ذات باری کے لئے کمال صفات ضروری ہے جو اسے من کل الوجوہ حاصل ہے اسی لئے واجد مطلق فقط ذات باری ہے اور دیگر مخلوق کو اگر واجد کہا جائے گا تو صرف اضافی طور پر نہ حقیقی طور پر۔

خاصیت

لقمہ پر پڑھ کر کھلائے تو تقویت قلب حاصل ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمَاجِدُ

جل جلالہ

یہ اسم مجد سے مشتق ہے اور ماجد اور مجید میں وہی فرق ہے جو عالم اور علیم میں ہے گذشتہ صفحات میں اس کی تشریح ہو چکی ہے۔

خاصیت

جو دو ناپڑھے قلب منور ہو۔

اَلْوَاحِدُ الْاَحَدُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ اور پھر فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ہر دو اسم ذات باری کی وحدت کا مفہوم ظاہر کرتے ہیں اور ان ہر دو میں امتیاز کرنا چاہیے ضروری ہے کہ پہلے ظاہر تمہید کے حقیقت ذات کے ناممکن الادراک ہونے پر صحت کی جائے۔

واضح ہو کہ وحدت حقیقی ذات باری کا علم ناممکن ہے کیونکہ انسان واحد کو وحدت اضافی یا وحدت عددی کی صورت میں تصور کر سکتا ہے مگر ذات باری کی وحدت ان ہر دو سے بالاتر ہے کیونکہ وحدت اضافی کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی چیز باوجود کثرت پر مشتمل ہونے کے دوسری اشیاء کی نسبت واحد کہلا سکتی ہے مثلاً ایک چیز چند اشیاء کے مجموعہ کو ظاہر کرتی ہے مگر وہ بجائے خود واحد ہے مگر اس کی وحدت حقیقی نہیں کیونکہ وہ کئی اکائیوں کا مجموعہ ہے اور وحدت عددی کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شے سلسلہ شمار میں اگر بہ نسبت دیگر اشیاء معدودہ کے واحد کہلاتی ہے مثلاً ہم کسی چیز کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے ساتھ ویسے دوسری چیز کا وجود ممکن ہے اس طرح ہم ایک نوع کے دو فرد کو دو بولتے ہیں اس لئے کہ ویسے تیسرے فرد کا وجود ممکن ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس عدد کا درجہ ہم کسی

toobaa-elibrary.blogspot.com

فرد کے لئے تجویز کریں گے اس کے ساتھ اس کے مثل کا وجود ممکن ہو گا گو خارج میں اس کا مثل موجود ہونا محال نہیں ہو سکتا مثلاً مثل آفتاب خارج میں موجود نہیں مگر اس کا موجود ہونا محال نہیں بلکہ ممکن ہے اس لئے ذات باری کا واحد ہونا نہ تو بطور وحدت ضافی کے ہے اور نہ بطور وحدت عددی کے بلکہ اس کا واحد ہونا حقیقی ہے جس میں نہ تو کثرت کو دخل ہے اور نہ اس کا مثل ممکن ہے بلکہ اس کی وحدت کا اقتضا یہ ہے کہ اگر اس کا انکشاف ہو تو تمام موجودات عالم نیست و نابود ہو جاوے کیونکہ وجود حقیقی کے سامنے کسی دوسرے موجود کا ثابت الوجود ہونا ناممکن ہے اسی امر کی طرف ایک حدیث میں یوں اشارہ کیا گیا ہے لاحرقت سبحات وجهه من انتهى اليه بصره من خلقه یعنی اگر وہ ذات مظاہر کائنات پر جلوہ افروز ہو تو اس کے انوار تمام موجودات کو جلا دیں اور کوئی غیر اللہ معرض وجود میں نہ رہے ولعم ما قال الشیر ازی

چو سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کو قرآن مجید میں پڑھو حالانکہ اپنی تجلی صفات کا مقام تھا نہ تجلی ذات کا قال اللہ تعالیٰ فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا وخر موسی صعقا اسی امر کی طرف اشارہ ہے آیت لو انزلنا هذا القرآن علی جبل الآیۃ انسان جو کچھ ذات باری کے متعلق تصور کرتا اور تجویز کرتا ہے ذات باری اس سے بالاتر ہے کیونکہ انسان ایک مخلوق عاجز ہے اور مخلوق اپنے خالق کی حقیقت کا کیونکر ادراک کر سکتی ہے۔

ہاں ہر ایک شخص اپنے اپنے فہم و ادراک کے مطابق کچھ نہ کچھ سمجھتا ہے مگر ذات باری اس سے پاک اور بری ہے۔

برافگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاران دیگرے رائے پرستند

الغرض ذات باری کی کنہ یا حقیقت کا ادراک محال ہے اور عاجز انسان کو

بجز تسلیم ضعف و عجز کے کوئی چارہ نہیں۔

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

باد بدست سے مراد ناکامی ہے۔

جنید سید الطائفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حقیقت توحید کے بارے میں جو بہترین کلمات کہے گئے ہیں ان میں جناب صدیق اکبر نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں اصوب و اشرف ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں سبحان من لم یجعل لخلقه سبیلا الی معرفته الا بالعجز عن معرفته یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی مخلوق عاجز کے لئے اپنی طرف آنے کا بجز اقرار عجز کے کوئی راستہ نہیں مقرر کیا اسی خیال کو آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا ہے العجز من درك الادراك ادراك

اکابر حضرات ائمہ طریقت نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے کہ مقام توحید کی حقیقت کو الفاظ میں لانا ناممکن ہے کیونکہ جب کوئی شخص اس مقام کے متعلق کچھ کہے گا تو ضروری ہے کہ مخبر عنہ اور مخبر بہ اور مخبر تین امور وہاں موجود ہوں اور یہ امر منافی توحید ہے اس لئے عارف کامل بذریعہ شہود اس کو سمجھ سکتا ہے مگر الفاظ کو وہاں کچھ دخل نہیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ سے توحید کی بابت جب سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مقام توحید اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ آثار بشریت بالکلیہ مضمحل اور تمام علوم منتفی ہو جائیں اور صرف ذات واحدہ ہو جو ازلی و ابدی ہے منصور مغربی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے جامع منصور عباسی واقع بغداد میں حضرمی کو توحید کے بارہ میں کلام کرتے سنا جب میں سویا تو مجھے رویا میں دو ملائکہ نظر آئے جو آسمان کی طرف جا رہے تھے اور ایک دوسرے کو کہہ رہا تھا کہ حضرمی (منسوب بہ حضر موت جو بلاد یمن میں ہے) نے جو کچھ کہا ہے یہ اس کے علم کا نتیجہ ہے مگر توحید اس سے بالاتر ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

یوسف بن حسین فرماتے ہیں کہ جو شخص توحید کے دریا میں تیرتا ہے اس کی پیاس اور بھی بڑھتی ہے۔

الغرض توحید ذات باری کا مقام ہم جیسے لوگوں کی تعمل و تامل سے بالاتر ہے اور جن اہل ظاہر نے اس میں کچھ کلام کیا ہے انہیں بجز ہوسناکی کے کچھ حاصل نہیں ہوا کم علم لوگ غلطی سے اپنی جگہ کچھ سمجھ کر اپنے تئیں عارف حقیقت سمجھنے لگ جاتے ہیں اور یہ عین جہالت ہے حق یہ ہے کہ جس قدر کسی شخص کا مبلغ علم بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کو یہ مرحلہ سخت و شوار گزار نظر آتا ہے و تعمق و تامل۔

گفتا غلطی زمانشاں خواں دلو انما تو ہر آنچہ دیدہ پایہ تست

(شاعر نے اس شعر کو گویا ذات باری کا مقولہ قرار دیا ہے مطلب یہ کہ اے ہماری حقیقت کی لو لگانے والے ہمارا پتہ تمہیں نہیں ملے گا۔ جو کچھ تم سمجھو گے وہ تمہارا اپنا علم ہے حقیقت نہیں)

اس تمہید کے بعد اسماء احد و واحد کی ضروری تشریح کی جاتی ہے سو واضح ہو کہ اسم واحد سے کبھی تو نفی کثرت مراد لی جاتی ہے اور کبھی نفی ضد نفی کثرت کی صورت میں چند توجیہ بیان کی گئی ہیں اول یہ کہ واحد حقیقی وہ ذات ہے جو کسی صورت میں بھی تقسیم قبول نہ کرے نہ خارجی طور پر نہ ذہنی طور پر کیونکہ یہ خاصہ یا تو مادی اشیاء کا ہے یا اشیاء عقلی کا۔

استاد ابو اسحٰق کہتے ہیں کہ واحد ایک شے ہے وہ عدم تقسیم کی قید کو حذف کر گئے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک جو چیز قابل تقسیم ہو ایک شے نہیں بلکہ دو شے کا مجموعہ ہے دوم یہ کہ واحد وہ ذات ہے کہ جس میں وضع اور رفع (کم کرنے اور دور کرنے) کو ہم تجویز کر سکتے ہوں مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں مرد بلادست و پا مگر واحد حقیقی کی نسبت ایسا خیال کرنا باطل ہے۔

سوم یہ کہ واحد وہ ذات ہے جو سلسلہ شمار میں نہ آسکے یعنی عدد کے تعلق سے بری ہے کیونکہ عدد ایک ایسی مقدار کو کہتے ہیں جو اپنی ہر دو اطراف

کے مجموعہ کا نصف ہو مثلاً چار نصف ہے تین اور پانچ یعنی آٹھ کا مگر واحد کی دو طرفین تحقق نہیں کیونکہ اس کی صرف ایک ہی طرف ہے اس لئے واحد سلسلہ اعداد میں شمار نہیں ہو سکتا بلکہ واحد تمام لاتناہی اکائیوں کا منبع ہے یہاں یہ خیال صحیح نہیں کہ جوہر فرد (جزلایتجزے) کی طرح واحد حقیقی میں حقارت یعنی چھوٹا پن پایا جائے گا کیونکہ یہ امر محسوسات مادیہ کے متعلق ہے ذات باری اس سے بری ہے۔

دوسری صورت میں اس اسم کی تفسیر یہ ہو گی کہ کوئی موجود اس ذات حقیقی کے ساتھ وجوب ذاتی علم تمیز الممکنات قدرت علی جمیع الممکنات میں مساوی نہیں اس لئے نہ تو کوئی موجود اس کا مثل ہے اور نہ نظیر اس لئے واحد حقیقی بھی اس ذات مطلق کے سوا کوئی موجود نہیں ہو سکتا۔

اسم احد کے متعلق زجاج نحوی کہتے ہیں کہ احد اصل میں واحد ہی ہے ازہری کی تحقیق کے مطابق زجاج نے اس کو وحد یوحد فھو وحد بروزن حسن یحسن فھو حسن سے مشتق کیا پھر وحد کی واؤ کو ہمزہ سے بدل کر احد کہنے لگے جیسے وساح (خوبصورت عورت) کو اساح بول دیا کرتے ہیں خلیل کا مذہب بھی یہی ہے۔

واضح ہو کہ احد اور واحد میں تین طرح فرق ظاہر کیا جا سکتا ہے اول یہ کہ واحد سلسلہ شمار کے آغاز کو کہتے ہیں یعنی واحد اثنان ثلاثہ تو بول سکتے ہیں مگر احد واثنان و ثلاثہ نہیں بول سکتے۔

دوم یہ کہ احد سے جو عموم نفی کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے وہ واحد سے نہیں ہو سکتا مافی الدار واحد بل اثنان تو صحیح ہے اور مافی الدار احد بل اثنان غلط ہو گا۔

سوم یہ کہ لفظ واحد کسی چیز کی صفت واقع ہو سکتا ہے رجل واحد' ثوب واحد وغیرہ مگر صورت اثبات لفظ احد بجز ذات باری کے کسی چیز کی صفت واقع نہیں ہو سکتا مثلاً یہ تو کہہ سکتے ہیں اللہ احد مگر رجل' احد' اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

ثوب احد نہیں کہیں گے اس سے معلوم ہو کہ لفظ احد ذات باری کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس لئے اس پر لام التعریف لانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی مگر نفی کی صورت میں یہ لفظ واحد کی طرح غیر اللہ کی صفت میں بھی آجیا کرتا ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ لفظ احد کی جمع آحاد ہے مگر ازہری کہتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ سے اس جمع کی بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ معاذ اللہ اگر احد کی جمع آحاد تجویز کی جائے اور بعض علماء کا خیال ہے کہ آحاد واحد کی جمع ہے جیسے اشہاد جمع شاہد کی۔

سورہ اخلاص کے الفاظ ھو اللہ احد کی ترتیب پر غور کرنا چاہیے کیونکہ ان ہر سہ الفاظ کی ترتیب موجودہ علیحدہ علیحدہ مقامات کی طرف اشارہ کرتی ہے سب سے اول اور سب سے اعلیٰ مقام ان حضرات مقربین کا ہے جنہوں نے حقائق اشیاء کو چشم بصیرت کا مشاہدہ کر کے انہیں معدوم اور موجود بوجود حق پایا ہے یہ حضرات بجز ذات حقیقی کے کسی موجود کو فی الحقیقت موجود نہیں دیکھتے اس لئے بجز اس ذات واحد کے کوئی موجود فی الحقیقت مشار الیہ ہو ہی نہیں سکتا سو اس مقام میں لفظ ھو کا مشار الیہ در حقیقت متعین ہے بجز اس ذات واحد کے کسی اور کا گمان ہی نہیں جاتا اس مقام سے دوسرے درجہ پر اصحاب الیمین کا مقام ہے جو ذات واحد کے سوا دیگر ممکنات کو بھی موجود مانتے ہیں اس لئے اشارہ میں تمیز کی ضرورت داعی ہوتی ہے چنانچہ لفظ اللہ نے مشار الیہ کو غیر سے متعین کر دیا اور ھو اللہ ان کے لئے کافی ہو گیا۔

تیسرے درجے پر اصحاب الشمال ہیں جو بجز کثرت کے کچھ اور مشاہدہ نہیں کر سکتے اور وحدت خالص کے ساتھ کثرت کو لازم جانتے ہیں اور ذات باری میں کثرت کے قائل ہیں لہذا ان کے لئے ضرورت نفی کثرت کی داعی ہوئی کیونکہ لفظ احد ہی ہے یہ نفی ہو سکتی ہے نہ کسی اور لفظ سے اس لئے ان کو یوں سمجھایا ھو اللہ احد

اس مقام میں اس نکتہ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ذات باری کے صفات دو قسم کے ہیں اول اضافیہ جیسے عالم قادر خلاق دوم سلبیہ مثلاً یہ کہ وہ جسم نہیں یا جوہر نہیں یا عرض نہیں وغیر ذلک اور تمام مخلوقات اولا صفات اضافیہ پر دلالت کرتی ہے اور پھر صفات سلبیہ پر اس لئے جملہ ھو اللہ احد تمام صفات معتبرہ پر بدرجہ کمال دلالت کرتا ہے کیونکہ صفات قابل اثبات اور صفات قابل سلب ہر دو کا جامع ہے کیونکہ اسم اللہ جمیع کمالات مثبتہ پر مشتمل ہے اور اسم احد تمام صفات سلبیہ پر مگر حق یہ ہے کہ توحید ذات باری کی حقیقت کے بیان میں الفاظ کوتاہ ہیں چنانچہ ہم نے گذشتہ سطور میں اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے والعلم ما قیل

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا
واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

صاحب قال ہزاروں ہیں مگر کچھ مفید نہیں اور صاحب حال کوئی شاذ و نادر ہی ہوتا ہے مگر تمام مشکلات کو آسان کر دیتا ہے۔

حضرت جنید رحمتہ اللہ سے مروی ہے کہ توحید ایک حقیقت ہے جس سے رسوم بشریت محو اور علوم بالکلیہ معدوم ہو جاتے ہیں اور صرف وجود ذات باری جو ازلی و ابدی ہے باقی رہ جاتا ہے یوسف بن حسین کہتے ہیں کہ جو شخص توحید کے دریائے ناپیدا کنار میں تیرتا ہے اس کی پیاس روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے۔

بعض حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو صفات میں بدرجہ کمال پہنچ گئی ہو اور جس کا مثل ناپید ہو اور نہ اس کا کوئی شریک ہو جو اس کے ساتھ مساوات رکھتا ہو شبلی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو بندہ کو تمام مخلوق سے کافی ہو سکے اور تمام مخلوق اس ذات سے کافی نہ ہو سکے حسین بن منصور حلاج کہتے ہیں کہ واحد وہ ذات ہے جو سلسلہ شمار میں نہ آسکے اور بعض لکھتے ہیں کہ احد وہ ذات ہے جو ایجاد معدومات میں یگانہ اور اظہار خفیات

toobaa-elibrary.blogspot.com

میں یکتا ہو بعض نے لکھا ہے کہ احد وہ ذات ہے کہ جس کے وجود کی نہ تو غایت ہو اور نہ اس پر کسی کا حکم جاری ہو سکتا ہو اور کوئی اس کی امداد نہ کر سکے تفسیر احد میں شبلی علیہ الرحمتہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ ایک دفعہ ایک تاجر کی دکان پر بیٹھے تھے لوگوں نے کہا کہ آپ حساب جانتے ہیں فرمایا کہ ہاں انہوں نے بہت سے کاغذات حساب لا کر رقوم لکھنا شروع کیں جب وہ لوگ لکھ چکے تو دریافت کیا کہ کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا ایک وہ لوگ تعجب کرنے لگے آپ نے فرمایا کہ تعجب کیوں کرتے ہو ازل سے ابد تک بجز ایک کے کوئی اور بھی ہے عبد خالص واحد اس وقت ہوتا ہے جبکہ طے مقامات میں اپنی انائے جنس میں بیظیر ہو جاوے اور اگر کسی ایک وصف میں یگانہ ہو تو اس وصف کے لحاظ سے وہ واحد کہلائے گا مگر جمیع اوصاف میں بیظیر بجز ذات گرامی جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا ہاں اضافی کمالات اولیاء اللہ کو حاصل ہیں الغرض واحد حقیقی بجز ذات باری کے کوئی مخلوق نہیں۔

خاصیت

اگر ہزار بار پڑھے تعلق مخلوق کا اس کے قلب سے زائل ہو جاوے۔

اشهدان لا اله الا الله وحده لا شريك له الها واحدا احدا صمدا لم يتخذ صاحبة ولا ولدا ولم يكن له كفوا احد. (ترمذی)

الصَّمَدُ

جل جلالہ

قال الله تعالیٰ: اَللّٰهُ الصَّمَدُ اس اسم کی توجیہ دو طرح پر مشہور ہے اول تو یہ کہ صمد جس کا وزن صرفی فعل ہے بمعنی مفعول مستعمل ہے جس کے معنی ہیں من صمد الیہ یعنی وہ شخص جس کی طرف لوگ اپنی حاجات کو لیجائیں عرب بولتے ہیں بیت مصمود وبیت مصمد اذا قصده الناس فی حوائجهم یعنی ایسا گھر جہاں لوگ اپنی حاجات کے لئے رجوع کریں طرفہ کہتا ہے

وان يلتق الحی الجميع تلاقنی
الی قبة البيت الرفيع المصمد

لابہ لیث فرماتے ہیں کہ عرب بولتے ہیں صمدت صمد هذا الامرای قصدت قصده

دوم یہ کہ صمد ایسی چیز کو بولتے ہیں جو ٹھوس ہو یعنی اندر سے خالی نہ ہو چنانچہ شی مصمد ایسی چیز کو بولتے ہیں جو سخت ہو اور جس میں نرمی نہ ہو بعض متاخرین اہل لغت لکھتے ہیں کہ صمد سپاٹ پتھر کو بولتے ہیں جو غبار سے پاک ہو

toobaa-elibrary.blogspot.com

اور جس کے اندر کوئی چیز نفوذ نہ کر سکے اور نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر آسکے ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حرف دال حرف تاء کا بدل ہے سلف صالحین کا ایک گروہ اور بعض اہل لغت معنی ثانی کی تائید کرتے ہیں مگر ایک جماعت سلف اور خلف کی معنی اول کی طرف مائل ہوتی ہے شعبی کہتے ہیں کہ صمد اس سردار کو بولتے ہیں جو سیادت میں کامل ہو اور ابو اسحٰق کوفی عکرمہ سے راوی ہیں کہ صمد وہ ذات ہے جس سے بالاتر کوئی اور نہ ہو۔ اور علی اور کعب ابن الاحبار رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جس کی نظیر اس کی مخلوق میں معدوم ہو اور سدی سے مروی ہے کہ صمد وہ ذات ہے جو حصول مرغوبات کے لئے مرجع اور دفع مصائب کے لئے مستغاث ہو قرار پا سکے بالجملہ اس اسم کی اور بھی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں نظر بطول کلام ہم نے نظر انداز کر دیں ہاں صمد بمعنے سردار محتاج الیہ اہل عرب کے ہاں مستعمل ہے چنانچہ شعر ذیل میں۔

الابکر الناعی بخیر بنی اسد
بعمرو بن مسعود و بالسید الصمد

بعض جاہلوں نے لفظ صمد سے یہ استدلال کیا ہے کہ ذات باری جسم ہے مگر یہ سراسر باطل ہے کیونکہ اس کا احد ہونا اس خیال کی تکذیب کرتا ہے جسم اجزاء سے مرکب ہے اور جو مرکب ہے قابل تقسیم ہے اور تقسیم احدیت کی منافی ہے اور بس۔

ابوبکر وراق فرماتے ہیں کہ صمد وہ ذات ہے کہ خلقت جس کی کنہ کے دریافت کرنے سے عاجز ہو اور عقول جس کے اسرار حکمت کو نہ پا سکیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جب کسی کو منتخب فرما لیتا ہے تو وہ کامل طور پر اسم صمد کا مظہر قرار پاتا ہے جس سے وہ اہل عالم کے دینی اور دنیوی حوائج کے لئے مرجع بن جاتا ہے اور وہ ان کے حاجات کو رفع کرتا ہے۔

خاصیت

آخر شب میں ایک سو پچیس بار پڑھے تو آثار صدق وصدیقیت کے ظاہر ہوں اور جب تک اس کا ذکر کرتا رہے بھوک کا اثر نہ ہو۔

دعاء

اللھم انی اسالك انی اشھدانك انت الله لا اله الاانت الاحد الصمد الذی لم یلدولم یولد ولم یکن له کفواً احد (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الْقَادِرُ مصدر قدرت سے مشتق ہے اور قدر بقدر کبھی بمعنی مقدر کے بھی مستعمل ہوتا ہے یعنی قدرتہ بمعنی قدرتہ (اندازہ کردم) قال اللہ تعالیٰ فَقَدَّرْنَا فَنِعْمَ الْقَادِرُوْنَ یعنی قدرنا فنعم المقدرون اسی معنی کا استعمال ہوا ہے کہ ہم ان کی خطا پر انہیں باز پرس نہیں کریں گے ورنہ قدرت سے مشتق کرنے کی صورت میں آیت کے معنی صحیح نہیں ہو سکتے کیونکہ ایک نبی اللہ کبھی اللہ تعالیٰ کی نسبت یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ اس پر قدرت نہیں رکھتا اسم قدیر اسم قادر کا مبالغہ ہے جیسے عالم اور علیم مگر قدیر اسماء حسنیٰ میں شمار نہیں کیا گیا اگرچہ قرآن مجید میں وارد ہو چکا ہے۔

اسم مقتدر بھی بہ نسبت قادر کے معنی مبالغہ پر مشتمل ہے قال اللہ تعالیٰ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ اور اس کی نظیر ہے لَهَا مَاكَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اس آیت میں کسب کو خیر کے ساتھ اور اکتساب کو شر کے ساتھ ذکر کرنے میں یہ خوبی ہے کہ شر سے انسان بذریعہ وعظ اور دلائل شرعیہ کے روکا جا سکتا ہے۔

اس کے لئے بڑی قدرت کی ضرورت ہے اس سے معلوم ہوا کہ لفظ اقتدار بہ نسبت قدرت کے مبالغہ کو ظاہر کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قادر وہ ذات ہے جو اپنی مشیت کے مطابق خواہ کسی امر کو کرے خواہ نہ کرے ہر دو پر یکساں اختیار اور قدرت رکھتا ہو چنانچہ اس کمال اختیار قدرت کے لئے یہ شرط نہیں کہ قادر ضرور کسی امر کو کر ہی ڈالے کیونکہ کرنا اور نہ کرنا اس کی صفت حکمت کے تابع ہے اس لئے اگر وہ کسی امر کو کر ہی ڈالے تو اس کی حکمت پر مبنی ہوگا اور اگر نہ کرے تو بھی اس کی حکمت کا مقتضیٰ ہوگا اور قادر مطلق وہی ہو سکتا ہے جو اشیاء کو عدم سے وجود میں بلا معاونت غیر لا سکے اور یہ وصف بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہاں عبد کامل کو بھی فی الجملہ قدرت ناقصہ دی گئی ہے جس کو ایجاد و اعدام میں کچھ دخل نہیں بلکہ عبد صرف اسباب مناسبہ کے پیدا ہونے پر ان میں تصرف کر سکتا ہے اور بس۔

خاصیت

القادر

القادر دو رکعت پڑھ کر اس کو سو بار پڑھے تو اس کو قوت حاصل ہو اور اگر وضو کرتے ہوئے اس کی کثرت کرے تو دشمنوں پر غالب ہو۔

المقتدر

جب سو کر اٹھے اس کی کثرت کرے تو جو اس کی مراد ہو اس کی تدبیر اللہ تعالیٰ آسان کر دیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ

جل جلالہ

تقدم اور تاخر کی دو قسمیں ہیں ذاتی اور وضعی پھر ذاتی کی دو صورتیں ہیں اول علت کا اپنے معلول پر مقدم ہونا جیسے انگلی کی حرکت کا انگوٹھی کی حرکت پر مقدم ہونا اور شرط کا اپنے مشروط پر مقدم ہونا جیسے حیات جو شرط علم ہے اور وضعی کی تین صورتیں ہیں اول تقدم زمانی جیسے ذات باری کے بعض افعال کا بعض پر مقدم ہونا جن کی قبلیت اور بعدیت صرف اسی کے تعلق پر مبنی ہے ورنہ فی حد ذاتہ نہ تو اس کا کوئی فعل متقدم ہے نہ متاخر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ فعال ذات باری کا متقدم و متاخر ہونا سلسلہ سبب و مسبب کے قائم کرنے کی حکمت پر مبنی ہے دوم تقدم مکانی مثلاً آسمان کا فوق اور زمین کا تحت حالانکہ اس کا برعکس بھی متصور تھا مگر اس کی حکمت کاملہ کا اقتضاء یوں ہی تھا سوم تقدم باشرف یعنی بعض مخلوق کو بعض دیگر پر بلحاظ صفات کاملہ کے شرف کا حاصل ہونا اور اس لئے وہ متقدم ہو گا بہ نسبت اس مخلوق کی جس میں وہ صفات موجود نہیں۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ مقدم و موخر وہ ذات ہے جو کسی مخلوق

کو اپنا قرب عطا فرمادے اور کسی دوسری مخلوق کو اپنی بارگاہ قرب سے بعید کر دے چنانچہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو اپنی بارگاہ میں قرب عطا کیا ہے اور ان کے مخالفین کو اپنے قرب سے دور پھینک دیا ہے اس قرب و بعد میں بہت سے مدارج ہیں چنانچہ ہر ایک مقرب بہ نسبت اپنے سے متقدم کی متاخر کہلاتا ہے اور ہر ایک متاخر متقدم اور اس تمام سلسلہ تقدم و تاخر کی غایت ذات باری پر ختم ہو جاتی ہے اِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی اور وہی ذات باری جو مفیض الخیرات ہے کسی کو قریب کرتی ہے اور کسی کو بعید اور ان ہر دو اسم میں اشارہ ہے کہ کوئی شخص مدارج علم و عمل مقرب نہیں بن سکتا جب تک اس کا فضل شامل حال نہ ہو قال اللہ تعالیٰ اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَہُمْ مِنَّا الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْہَا مُبْعَدُوْنَ انسان کامل کو ان ہر دو اسم سے یہ بہرہ ہے کہ وہ مخلوقات میں ان کی خصوصیات کے لحاظ سے قرب و بعد کے مدارج قائم کرے اور ترتیب افعال کو مدنظر رکھے۔

خاصیت

المقدم

معرکہ میں جا کر پڑھے تو قوت اور نجات ہو۔

المؤخر

کثرت سے پڑھے تو برے کاموں سے توبہ نصیب ہو۔

دعاء

اللھم لک سجدت وبک آمنت ولک اسلمت سجدوجھی للذی خلقہ وصورہ وشق سمعہ وبصرہ تبارک اللہ احسن الخالقین ثم یقول من اخرما یقول بین التشھد والتسلیم اللھم اغفرلی ماقدمت وما اخرت وما اعلنت وما اسررت وما انت اعلم بہ منی انت المقدم وانت المؤخر لا الہ الا انت (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

الاوّل الآخر

حل جلالہ حل جلالہ

کوئی ایک چیز ایک ہی جہت سے کسی امر مخصوص کی نسبت اول و آخر نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا اول ہونا کسی اور جہت سے ہو گا اور آخر ہونا کسی دوسری جہت سے کیونکہ دو متضاد امور کا مصداق ایک ہی چیز نہیں ہو سکتی جب ہم سلسلہ کائنات کی ترتیب میں غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ وجود میں ذات باری سب سے اول ہے کیونکہ تمام موجودات نے اس سے لباس ہستی لباس پہنا اور خود بذاتہ موجود ہے مگر منازل معرفت میں وہ تمام اشیاء کی معرفت کا آخری مقصد ہے کیونکہ گذشتہ صفحات میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی چیز بجز ذات باری کے مطلوب حقیقی نہیں ہو سکتی بلکہ جن اشیاء کی معرفت ہم حاصل کرتے ہیں وہ آئندہ حقائق معرفت کے لیے بطور شرط کے ضروری ہیں اور غائت حقیقی معرفت ذات باری ہے لہذا وہ ذات مقدس وجود میں سب سے اول اور معرفت میں سب سے آخر ہے یہی معنے ہیں اس جملہ کے وہی ذات مبدء ہے اور وہی مرجع اہل دل نے ان اسماء کی تشریح میں مختلف اشارات کئے ہیں مثلاً (ا) وہ ذات مقدس اول ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں اور آخر ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں۔

(ب) وہ ذات مقدس اول ہے ایجاد خلق میں اور آخر ہے ہدایت و توفیق میں (ج) اول بالذات ہے اور آخر بالصفات (د) اول ہے وجوب و قدم کے رو سے آخر ہے حدوث و عدم سے پاک ہونے کی وجہ سے (ہ) اول ہے بلحاظ محبت سابقہ کے اولیاء کے حق میں آخر ہے بلحاظ غضب سابق کے اعداء کے حق میں وغیر ذلک۔

واضح ہو کہ ذات باری کے متعلق سوال کی کئی ایک صورتیں ہیں مثلاً کیا وہ موجود ہے اس کا جواب دیا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وہ کس طرح ہے؟ اس کا جواب دیا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وہ کیا ہے؟ رَبُّکُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِکُمُ الْاَوَّلِیْنَ اس میں اشارہ ہے کہ اس کی معرفت کا طریق یہی دلائل قطعیہ ہیں جو اس کے وجود پر دال ہیں وہ کس قدر ہے؟ اس کا جواب دیا وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ وہ کہاں ہے؟ اس کا جواب دیا اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی وہ کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کا جواب دیا لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ وہ کیا چیز ہے؟ اس کا جواب دیا ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا یعنی کوئی چیز ذات صفات میں اس کی نظیر نہیں وہ کب سے ہے؟ اس کا جواب دیا ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ اس کا تصرف کس قدر ہے؟ اس کا جواب دیا قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ الآیۃ اس کا علم کس قدر ہے اس کا جواب دیا عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ اسکا کلام کس قدر ہے اس کا جواب دیا۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ اس کے اسماء کیا ہیں؟ اس کا جواب دیا لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی

خاصیت

الاول

اگر مسافر ہر جمعہ کو ہزار بار پڑھے تو جلدی اپنے لوگوں سے آملے

الآخر

اگر ہر روز ہزار بار پڑھے تو ماسوی اللہ دل سے نکل جاوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلظَّاهِرُ الْبَاطِنُ

جل جلالہ

یہ ہر دو اسم بھی مذکورہ بالا ہر دو اسم کی طرح مجملہ امور اضافیہ کے ہیں یعنی کوئی چیز ایک ہی جہت سے ظاہر و باطن نہیں ہو سکتی کیونکہ ایک ہی چیز ایک خاص شخص کے ادراک کی نسبت ظاہر کہلا سکتی ہے اور دوسرے شخص کے ادراک کی نسبت باطن سو ذات باری ادراک حواس کے رو سے باطن ہے اور استدلال عقل کے رو سے ظاہر۔ مگر یہاں یہ سوال عائد ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ظاہر ہے تو کیوں اس کے ادراک میں اس قدر اختلافات دنیا میں موجود ہیں؟

اس سوال کا جواب امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ یوں قلمبند کرتے ہیں کہ ذات باری عزاسمہ غایت ظہور کی وجہ سے مخفی ہے یعنی اس کا بدرجہ غایت ظاہر ہونا اس کے مخفی یا باطن ہونے کا سبب ہے یا یوں کہو کہ اس کا نور ہی اس کے نور کا حجاب بن رہا ہے اور قاعدہ ہے کہ جو چیز کسی وصف میں درجہ متعارف سے بدرجہ کمال متجاوز ہو جاتی ہے' وہ اس وصف کی ضد سے موصوف معلوم ہونے لگتی ہے اس کی تفصیل یوں سمجھو کہ اگر ہم حروف کو کاغذ پر منقوش دیکھیں تو ہمیں مجرد دیکھنے کے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ان حروف کا کاتب عالم' قادر' سمیع

بصیر ہے یا یوں کہو کہ کاتب کو صفات علم' قدرت' سمع' بصر سے موصوف ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اگر کاتب یہ صفات نہ رکھتا ہو تو وہ کاتب حروف نہیں ہو سکتا جس طرح ہم لکھے ہوئے حروف سے ان کے لکھنے والے کے نہ صرف وجود کا یقین حاصل کر لیتے ہیں۔ بلکہ اس کو مذکورہ بالا صفات سے موصوف تسلیم کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں اس طرح صفحہ ہستی پر ایک ایک ذرہ کائنات کا خواہ زمینی ہو یا آسمانی اپنی زبان حال سے نہ صرف اپنے خالق اور مدبر کے وجود کی طرف اشارہ کر رہا ہے بلکہ اس کے کامل الصفات ہونے کی بھی شہادت دے رہا ہے اور خود انسان کا ایک ایک عضو جو اندرونی ہو یا بیرونی بلکہ اس کی ایک ایک صفت اور حالت جن پر وہ اپنی زندگی کی رفتار کو طے کر رہا ہے قطعی طور پر اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ان کا ایک خالق قاہر مدبر موجود ہے اگر اس شہادت میں اختلاف ہوتا یعنی اگر بعض اشیاء وجود خالق پر شاہد ہوتیں اور بعض نہ ہوتیں تو وجود خالق میں کچھ اختلاف نہ ہوتا مگر جب ایک ایک ذرہ کائنات کا وجود خالق پر دلیل قطعی ہے۔

وفی کل شیء له ایة تدل علی انه واحد

تو کچھ شک نہیں کہ یہی امر لوگوں کے لئے ادراک خالق میں موجب اختلاف ہو رہا ہے اور غایت ظہور کی وجہ سے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔ دیکھو محسوسات خارجیہ میں سب سے واضح الادراک جرم آفتاب ہے جو تمام اشیاء عالم کے ظہور کا موجب ہے کیونکہ اس کے غروب پر تمام اشیاء آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عدم نور سے ہمیں نور کا علم حاصل ہوتا ہے اگر آفتاب وسط آسمان میں ٹھہر رہتا اور نقل و حرکت نہ کرتا تو بہت سے لوگ ایسے ہوتے جو یہ کہتے کہ اشیاء خود بخود روشن ہیں آفتاب ان کے ظہور کا موجب نہیں اسی طرح اگر ذات باری اپنا فیضان وجود ایک آن کے لئے بعض اشیاء سے روک لے تو فی الفور وہ اشیاء حیز عدم میں مخفی ہو جائیں مگر چونکہ تمام اشیاء یکساں طور پر خالق حقیقی کے وجود پر دال ہیں اور ان کی شہادت میں

toobaa-elibrary.blogspot.com

کچھ اختلاف نہیں تو بھی یکسانیت لوگوں کے لئے موجب اشتباہ ہو گئی متضاد حالتوں کے مشاہدہ کئے بغیر اور احد الضدین کا علم حال نہیں ہو سکتا مگر عالم کائنات میں عدم کا کہیں نشان نہیں ہر ایک چیز موجود ہے اور جو موجود ہے وہی اپنے خالق مدبر کے وجود پر دال ہے اس لئے وہ ذات حقیقی غایت ظہور کی وجہ سے آفتاب کی طرح مخفی ہے کیونکہ آفتاب تمام موجودات کے ظہور کا موجب ہے مگر قوت باصرہ اس کی تاب نہیں لا سکتی۔ بعض اہل حقیقت کی عبارات میں ذیل کا جملہ واقع ہوا ہے جو مذکورہ بالا حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے حیث قال سبحن من اختفی عن العقول بشدۃ ظہورہ واحتجب بکمال نورہ اسم باطن کی توجیہ یوں بھی ہو سکتی ہے کہ کنہ ذات باری خلائق پر مخفی ہے یا یہ کہ ابصار اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں یا یہ کہ اس ذات حقیقی کا علم تمام مخفیات پر محیط ہے کچھ ہو ظہور و بطون کی وصف حقیقۃ اسی ذات پر صادق آسکتی ہے ہاں انسان بھی ظاہر ہے جبکہ وہ ظواہر کائنات سے استدلال کر کے معرفت ذات باری کو حاصل کرے اور وہ باطن ہے جبکہ وہ اپنے نفس کی طرف رجوع کر کے انوار تجلیات کا مورد بن جائے۔

خاصیت

الظاہر اشراق کے وقت بکثرت پڑھے تو قلب میں نور ولایت ظاہر ہو۔

الباطن ہر روز تین بار ایک گھنٹہ تک اس کو پڑھے تو کیفیت انس کی حاصل ہو۔

دعاء اللھم رب السموات ورب الارض ورب العرش العظیم ربنا ورب کل شیئی فالق الحب والنوی ومنزل التوراۃ والانجیل والفرقان اعوذبک من شرکل شیئی انت اخذ بناصیتہ اللھم انت الاول فلیس قبلک شیئی وانت الاخر فلیس بعدک شیئی وانت الظاہر فلیس فوقک شیئی وانت الباطن فلیس دونک شیئی ان اقض عنا الدین واغننا من الفقر (حصن حصین)

الوالی

جل جلالہ

یہ اسم قرآن شریف میں وارد نہیں ہوا اور اس کے معنے اس ذات کے ہیں جو اشیاء پر غالب ہو اور ان میں اپنی مشیت کے مطابق کامل تصرف کرے اسم ولی میں اس کی تشریح مذکور ہے۔

خاصیت

اس کی کثرت کزک محل سے محفوظ رکھتی ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُتَعَالِیُ

جل جلالہ

یہ اسم علو مصدر سے مشتق ہے اور اس کے معنے وہی ہیں جو اسم علی کے ہیں ہاں متعال میں مبالغہ کا مفہوم بھی داخل ہے۔ اسم علی کا مطالعہ کرو۔

خاصیت

اس کے ذکر سے رفعت اور درستی حاصل ہو۔

اَلْبَرُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ بر بالکسر مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی نکوئی اور احسان کے ہیں اس لیے بر کے معنے محسن کے ہوئے۔ یحییٰ علیہ السلام کی وصف میں وارد ہوا ہے۔ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ اور مسیح علیہ السلام کی صفت میں بَرًّا بِوَالِدَتِيْ گیا ہے۔

واضح ہو کہ بر اور بار کے ایک ہی معنی ہیں اور بر یعنی محسن فی الحقیقت بجز ذات باری کے کوئی مخلوق نہیں کیونکہ اس کے احسانات بلا معاوضہ ہیں جن کا کبھی حصر نہیں کیا جا سکتا اور وہ دو قسم کے ہیں دینی اور دنیوی اور پھر ان میں سے ہر ایک ظاہری ہے اور باطنی کما قال اللہ تعالیٰ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک قسم کے اعمال بر میں مستقیم الحال ہوتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ الآیۃ میں جمع کر دیا ہے اور تکمیل بر کی شرط یہ ہے کہ سب سے احسن اور ہر محبوب چیز کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں صرف کیا جائے قال

toobaa-elibrary.blogspot.com

اللہ تعالیٰ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ اور تمام اقسام بر سے اعلیٰ اور اشرف بر وہ ہے جو والدین کے حق میں کی جاتی ہے قال اللہ تعالیٰ وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا دیکھو مذکورہ بالا آیات میں یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو کس طرح اللہ تعالیٰ نے وصف بر سے یاد کیا ہے اور اپنے اساتذہ و مشائخ سے نکوئی اور احسان بر تا بھی اسم بر کا مقتضی ہے اور کمال بر یہ ہے کہ عبد اپنے احسان کو کسی محل خاص سے مخصوص نہ کرے بلکہ بر خداوند تعالیٰ کا تتبع کرنا ضروری ہے جس کا حصر کرنا بجملہ محالات کے ہے اس امر سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا البر لا یبلی یعنی نکوئی کبھی بوسیدہ نہیں ہوتی۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ بر وہ ذات ہے جو اصحاب ارادت پر کشف طریق اور اصحاب عبادت کو اپنے فضل و توفیق سے بہرہ یاب کرے بعض لکھتے ہیں کہ بر وہ ذات ہے جو معصیت کی وجہ سے بندہ سے اپنا انعام و احسان منقطع نہ کرے۔

خاصیت

اگر سات مرتبہ پڑھ کر چہ پر دم کیا کرے تو نیک خط اٹھے۔

التَّوَّابُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ فَتَابَ عَلَیْہِ اِنَّہٗ ھُوَالتَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اور پھر فرمایا ھُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ اس اسم کی تشریح میں وجوہ ذیل بیان کئے گئے ہیں اول یہ کہ تاب و آب واتاب ہر سہ بمعنی رجع آیا کرتے ہیں اس لئے تواب کے معنے ہوئے وہ ذات جو اپنے بندوں پر انواع احسانات کے ساتھ رجوع کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ بندہ جب مختلف گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی کوئی صورت رہائی کی نہیں سوجھتی تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ازلی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور اس کو راہ ہدایت پر لا کر گناہ سے بالکلیہ بر طرف کر دیتی ہے جس کا پہلا نشان ہے کہ تائب کے دل پر خشیت و عبودیت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور وہ مقام حساب میں ہر وقت اپنے تئیں کھڑا دیکھتا ہے چنانچہ وہ اپنی اصلاح ظاہری و باطنی کی طرف لگ جاتا ہے جس سے وہ ان انعامات باطنی کا مستحق ہو جاتا ہے جن سے بوجہ معصیت پہلے محروم تھا اور ہر ایک قسم کی تنگی اور مصیبت کو اس سے دور کر دیا جاتا ہے الغرض ادھر بندہ معصیت سے رجوع کرتا ہے ادھر اللہ تعالیٰ اپنے انعام و اکرام سے اس کو بہرہ یاب کرنے لگتا ہے اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

یہی معنے ہیں اسم توب کے مگر معصیت سے باز آنا جائے خود توفیق خداوندی پر منحصر ہے جس کو چاہتا ہے خالص توبہ کا مقام عطاء فرماتا ہے ورنہ بندہ خود اپنی محنت وسعی سے کبھی صاحب تقوی نہیں ہو سکتا۔

جہاں آفریں گرنہ یاری کند
کجا بندہ پرہیز گاری کند

دوم یہ کہ لفظ توبہ لازم و متعدی ہر دو طریق پر مستعمل ہے یقال تاب اللہ علی العبد بمعنے انہ وفقہ للتوبۃ حتی تاب قال اللہ تعالی ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا یعنی اللہ تعالی نے ہمیں توفیق توبہ دی تاکہ وہ توبہ کریں اس لئے اسم تواب کے معنے ہوئے وہ ذات جو اپنے بندوں کو طاعت کی توفیق دے۔

سوم توبۃ اللہ علی العبد کے معنے ہیں کہ اللہ تعالی بندہ کی توبہ قبول فرما لیتا ہے انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ وہ بندگان خدا میں سے مجرمین کے عذر کو قبول کر کے ان سے درگذر کر جائے خواہ وہ کتنی دفعہ مجرم ثابت ہوں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ تواب وہ ذات ہے جو بندہ کی دعا کے مقابلہ میں عطا اور عذر کے مقابلہ میں مغفرت اور ملامت کے مقابلہ میں اجابت نازل فرماوے۔

خاصیت

بعد نماز چاشت ۳۶۰ بار پڑھے تو توبہ کی توفیق حاصل ہو اور اگر ظالم پر دس بار پڑھے تو اس سے خلاصی ہو۔

دعاء

رب اغفرلی وتب علی انک انت التواب الغفور (ترمذی)

اَلْمُنْتَقِمُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ اسم منتقم اسی سے مشتق ہے اور انتقام ذات باری سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا معصیت اور کفر پر بندہ کو اس معرض عذاب میں لانا جس کا وہ مستوجب ہے اور بندہ مستوجب عذاب نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا کچھ بھی خوف اس کے دل میں باقی ہو اور جب بندہ غضب الٰہی اور اس کے مواخذہ سے غافل ہو کر بے لگام ہو جاتا ہے اور کھلم کھلا ارتکاب معاصی پر اترتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غضب بصورت عذاب اس پر نازل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کی کمزوری فطرت کا علم رکھتا ہے اس لئے وہ بندہ کو ایک کافی مہلت دیتا ہے تاکہ وہ رجوع الی اللہ کر کے اپنے تئیں عذاب سے بچا لے اور یہ اس کے وسیع علم کا نتیجہ ہے مگر جب حجت کے تمام پہلو اس پر پورے کر دیئے جاتے ہیں اور عذر کا کوئی موقع نہیں رہتا تو وہ اپنے بطش شدید کو عمل میں لاتا ہے جس کو کوئی ٹالنے والا نہیں یہی وجہ ہے کہ کلام پاک میں فرمایا کہ ہم اپنے رسول بھیجے بغیر کبھی عذاب نازل نہیں کرتے۔ اس موقع پر اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بعض اہل ظاہر عموماً یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص باوجود انواع و

toobaa-elibrary.blogspot.com

اقسام معصیت کے ہر ایک قسم کی رقابت دامن میں زندگی بسر کر رہا ہے اور اس پر کوئی وبال نہیں آتا مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ در حقیقت اس شخص پر اتمام حجت ہو رہا ہے تاکہ تمام مراتب عصیان کو طے کر کے پورے پورے عذاب کا مستوجب قرار پائے اگر فی الفور ارتکاب گناہ پر پکڑا جاتا تو عذاب شدید کا مورد نہ بنتا بغرض نزول عذاب کے لئے غضب الٰہی کا حد سخط کو پہنچنا ضروری ہے قال اللہ تعالیٰ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبد اسوقت اس اسم کا مظہر کامل ہوتا ہے جب وہ دشمنان دین سے انتقام لے اور سب سے بڑھ کر دشمن انسان کا نفس ہے اس لئے سب سے زیادہ مورد انتقام نفس ہونا چاہیے چنانچہ شیخ ابویزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کی نسبت مروی کہ ایک رات اور لو مقررہ سے نفس نے غفلت کی آپ نے سال بھر اسے پانی سے محروم رکھا۔ فضیل رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص خوف رکھتا ہے اس پر ہر ایک قسم کی نیکی آسان ہو جاتی ہے جنید رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عبد کو چاہیے کہ مادر کی طرح پرہیز کا پابند ہو ایسا نہ ہو کہ ایک بد پرہیزی سے مدتوں مجاہدہ کا خمیازہ بھگتنا پڑے بعض مشائخ نے لکھا ہے کہ منتقم وہ ذات ہے جس کا انتقام اس کی نعمت سے علیحدہ نہ ہو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نعمت ہی کو نقمت بنا دیتا ہے اور بعض عارفین نے لکھا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عظمت کو جان لیتا ہے وہ ہر وقت اس کے عذاب سے خائف رہتا ہے اور جو شخص اس کی رحمت کا علم حاصل کر لیتا ہے وہ اس کی نعمت کا امیدوار ہو جاتا ہے۔

خاصیت

جو شخص اپنے ظالم دشمن سے انتقام نہ لے سکتا ہو تو اس کی کثرت کرے اللہ تعالیٰ انتقام لے لیں۔

اَلْعَفُوُّ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا پھر فرمایا وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ اس اسم کی تفسیر میں مختلف وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) عفو کے معنے لغت میں مٹا دینے اور دور کرنے کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں عفت الدیار اذا درست یعنی جب گھر کے آثار بے نشان ہو جائیں اس صورت میں عفو خداوندی کے یہ معنی ہوں گے اس کا بندہ کے گناہوں کو نامہ اعمال سے بالکلیہ محو کر دینا اور قیامت کے دن ان پر مواخذہ نہ کرنا اور نہ صرف اسی قدر بلکہ بندوں کے دلوں سے انکا فراموش کر دینا کیونکہ میدان حشر میں گناہوں کی یاد بھی موجب خجالت وندامت ہو گی اور محو کرنے کے بعد ہر ایک سیئہ کے عوض حسنہ کا ثواب عطا فرمانا قال اللہ يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ اور پھر فرمایا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ

تنبیہ

عفو میں مغفرت کی نسبت مبالغہ کا مفہوم مندرج ہے کیونکہ عفو کے

toobaa-elibrary.blogspot.com

معنے بالکل مٹا دینے کے ہیں اور مغفرت صرف مستور کر دینے کو بولتے ہیں جملہ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْلَنَا وَارْحَمْنَا میں غور کرو کہ کس طرح ہر سہ الفاظ کو ترتیب وار رکھا ہے کیونکہ عفو سے گناہوں کا نامہ اعمال سے مٹا دینا مراد ہے اور مغفرت سے مستور کر دینا تاکہ گناہ کی یاد موجب ندامت نہ ہو اور رحمت سے انعام جنت مراد ہے جو غایت الغایات ہے۔

(ب) عفو کے معنے زائد کے ہیں قال اللہ تعالیٰ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ اہل عرب بولتے ہیں عفا مال فلان اذا کثر اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ عفو وہ ذات ہے جو کثیر العطا ہو اور منعم علیہ کو محنت طلب کی تکلیف نہ دے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ ان لوگوں سے جو اس کے حق میں ظلم کریں قصور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنے احسان کو ان سے نہیں روکتا اور نہ انہیں ان کی بدسلوکی یاد دلا کر ملزم کرتا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا جب عبد اس صفت سے متصف ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قصوروں کو معاف فرما دیتا ہے۔ چنانچہ ابن عاصم مکری کی نسبت مروی ہے کہ ان کے ایک غلام کے ہاتھ سے کباب جو گرم سیخ میں لگا تھا ان کے چھوٹے بچہ پر گرا جس سے بچہ مر گیا اپنے غلام سے کہا کہ جاؤ میں نے تمہیں فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے اپنے ایک غلام کو آواز دی غلام نہ آیا پھر پکارا پھر بھی غلام نے جواب نہ دیا تیسری دفعہ پکارا تب بھی غلام نہ بولا خود اٹھے اور غلام کو لیٹے پایا آپ نے پوچھا کہ تم نے میری آواز نہیں سنی؟ غلام نے عرض کیا کہ میں نے آواز سنی آپ نے پوچھا کہ تم نے جواب کیوں نہیں دیا؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے عفو و حلم پر اعتماد تھا لہذا خاموش رہا آپ نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہیں فی سبیل اللہ آزاد کر دیا۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ عفو وہ ذات ہے جو نفوس سے ظلمت

گناہ کو اپنی رحمت سے دور کر دے اور قلوب کی وحشت غفلت کو اپنی کرامت سے پاک کر دے۔

بعض مشائخ کی نسبت مروی ہے کہ بعد از مرگ نہیں کسی مرد صالح نے خواب میں دیکھ اور پوچھا کہ اللہ نے آپ سے کیسا سلوک کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ محاسبہ میں سخت دقت کی گئی اور بعد از محاسبہ عفو کلی سے کام لیا گیا۔

خاصیت

بکثرت ذکر کرے تو گناہوں سے معافی اور رضائے الٰہی حاصل ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

الرَّؤُف

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ بِالنَّاسِ لَرَؤُفٌ رَّحِیْمٌ اور پھر فرمایا بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ یہ اسم مصدر رافۃ سے مشتق ہے جس کے معنے شدت رحمت کے ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ آیات مسطورہ بالا میں اسم رؤف کو رحیم پر مقدم کیا گیا ہے اور جہاں یہ ہر دو اسم آئے ہیں اسی ترتیب سے آئے ہیں لہذا ان میں وجہ امتیاز کا سمجھنا ضروری ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ رافت کا مبداء فاعل کی ذات میں ہوتا ہے یعنی رؤف کی ذات مقتضی ہوتی ہے کہ اپنے احسان کو شخص مرحوم تک پہنچائے اور رحمت کا مبداء مفعول کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یعنی مرحوم کی حالت فاقہ یا ضعف وغیرہ مقتضی ہوتی ہے کہ رحیم اس پر اپنی رحمت کرے اور یہ ظاہر ہے کہ ایجاد فعل میں فاعل کی حالت کو مفعول کی حالت کی نسبت زیادہ دخل ہوا کرتا ہے اسی مناسبت سے اسم رؤف کو رحیم سے پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ رؤف وہ ذات ہے جو گنہگاروں کے حق میں

توبہ اور اولیاء کے حق میں عصمت عطاء فرمادے اور بعض فرماتے ہیں کہ رؤف وہ ذات ہے جو اپنے اولیاء کو ملاحظہ اغیار سے محفوظ رکھے اور نہیں بار اشغال سے کافی ہو جائے۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ جناب پیغمبر کسی سفر کے موقع پر تشریف لے جارہے تھے ایک عورت چہ گود میں لئے سامنے آئی اور عرض کیا کہ یارسول اللہ آپ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر زیادہ مہربان ہے بہ نسبت ماں کے بچہ پر مہربان ہونے کے۔ کیا یہ سچ ہے؟ حضور علیہ السلام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بجز منکر لا الہ الا اللہ کے کسی کو عذاب نہیں کرے گا۔

بعض صالحین سے مروی ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک بدکار آدمی رہتا تھا جب اس کا جنازہ اٹھایا گیا تو وہ جنازہ کو دیکھ کر راستہ سے علیحدہ ہو گئے تاکہ اس کے جنازہ میں شامل نہ ہونے پائے۔ ایک اور شخص نے اسے خواب میں نہایت آرام اور خوشی کی حالت میں دیکھا اس نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے کیسے سلوک کیا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اپنی رحمت سے مغفرت عطاء فرمائی اور کہا کہ میرے پڑوسی صالح مرد کو سنادو قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کے خزانہ ہائے رحمت کے مالک ہو جاتے تو تم اس کے صرف کرنے میں ضرور تنگی کرتے۔

خاصیت

اپنے غصہ کے وقت یا دوسرے کے غصہ کے وقت دس بار اس کو پڑھے اور دس بار درود شریف تو غصہ کو سکون ہو جاوے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

مَالِكُ الْمُلْكِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

جل جلالہ

اسم مالک الملک کی تفسیر گذشتہ صفحات میں بہ ضمن اسم جلیل گذر چکی ہے البتہ لفظ اکرام کی تفسیر ضروری ہے۔

واضح ہو کہ اکرام کا مفہوم انعام کے قریب قریب ہے مگر اکرام خاص ہے اور انعام عام۔ یعنی ہر ایک اکرام انعام ہے مگر ہر ایک انعام اکرام نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جلال وصف تنزیہ پر دلالت کرتا ہے اور اس لئے صرف ذات حقیقی اس کے تحقق کے لئے کافی ہے مگر اکرام وصف اضافی ہے یعنی ایسا وصف جس کا تحقق وجود غیر کو مستلزم ہے یہی وجہ ہے کہ وصف جلال کو ذکر میں مقدم رکھا ہے۔

اسم مالک الملک کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اسم ایسی ذات پر اطلاق کیا جاتا ہے جو اپنی مملکت میں حسب مشیت تصرف کر سکے اور ملک سے مراد مملکت ہے اور موجودات عالم بمنزلہ ایک مملکت کے ہے کہ اشیاء عالم باہم اس طرح مرتبط ہیں جس طرح بدن انسان کے اعضاء سو جس طرح ایک عضو دوسرے عضو کی معاونت کرتا ہے اسی طرح موجودات عالم کا حال ہے۔ اور ان سب کے

تناسب اور ضرورت پر یہ سلسلہ کائنات کا چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس مملکت کا مالک ہے عبد کامل کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی مملکت بدن کے اندرون و بیرون میں بہتر سے بہتر طریق پر تصرف کر سکتا ہے۔

خاصیت

مالک الملک

اس پر مداومت کرے تو مال و توانگری حاصل ہو۔

ذوالجلال والاکرام

اس کے ذکر کرنے سے عزت و بزرگی حاصل ہو۔

دعاء

اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علی کل شئی قدیر رحمن الدنیا والاخرۃ تعطیھما من تشاء وتمنع منھما من تشاء ارحمنی رحمۃ تغنینی بھا عن رحمۃ من سواک (حصن حصین)

اللھم اعظم لی نورا وعلی نور اواجعل لی نور اسبحان الذی تعطف العز وقال بہ سبحان الذی لبس المجد وتکرم بہ سبحان الذی لاینبغی التسبیح الا لہ سبحان ذی الفضل والنعم سبحان ذی المجد والکرم سبحان ذی الجلال والاکرام (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْمُقْسِطُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ اہل زبان کہتے ہیں اقسط فھو مقسط اذا عدل فی الحکم اس لئے اس کے معنے ہوئے وہ ذات جو حکم میں پورا عدل کرے اور قسط بمعنی جار یعنی ظلم کرنا قال اللہ تعالیٰ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا اور قسط، نکسر کے معنے نصیب اور بہرہ کے ہیں۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقسط وہ ذات ہے جو مظلوم کا ظالم سے انصاف لے اور اس وصف کا کمال یہ ہے کہ مظلوم کی رضا مندی میں ظالم کی رضا مندی بھی شامل کر دے اور یہ امر بجز ذات باری عزاسمہ کے کسی مخلوق کا کام نہیں اس کی مثال ایک حدیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ حضور علیہ السلام تشریف رکھتے تھے کہ یکایک آپ نے تبسم فرمایا عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا بابی انت وامی یا رسول اللہ حضور کے تبسم کی کیا وجہ ہے؟ ارشاد فرمایا کہ میری امت کے دو شخص حضور رب العزت میں حاضر ہوئے ایک نے عرض کیا کہ خدایا! اس شخص سے میرا انصاف لے بارگاہ خداوندی سے

(ظالم) کو حکم ہوا کہ اپنے بھائی کا معاوضہ ظلم واپس کرو اس نے عرض کیا خدایا! میرے نامہ اعمال میں کوئی نیکی باقی نہیں رہی جس سے میں اس کا معاوضہ دے سکوں پھر اللہ تعالیٰ نے مظلوم (داد خواہ) کو فرمایا کہ تمہارے بھائی کے پاس کوئی نیکی نہیں اب تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے عرض کیا خدایا! اگر اس کی کوئی نیکی نہیں تو میرے بار گناہ کو اٹھا لے حضور نے یہ فرمایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ یہ وہ احتیاج کا دن ہو گا جس میں ہر ایک شخص یہ چاہے گا کہ کوئی میرے بوجھ کو اٹھا لے پھر حضور نے فرمایا کہ احکم الحاکمین مظلوم (داد خواہ) کو کہے گا کہ جنت کی طرف دیکھو جب وہ دیکھے گا تو اسے سونے اور چاندی کے عظیم الشان قصور نظر آئیں گے جن پر نفیس موتی لگے ہوں گے تب وہ سوال کرے گا کہ خدایا یہ عالیشان محل کسی نبی یا صدیق یا شہید کے لئے ہیں ارشاد ہو گا کہ اس شخص کے لئے جو ان کی قیمت ادا کر دے پھر وہ عرض کرے گا کہ خدایا ان کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟ حکم ہو گا کہ تم ادا کر سکتے ہو تب وہ شخص عرض کرے گا خدایا کیونکر؟ ارشاد ہو گا کہ اپنے بھائی کے قصوروں کو معاف کر دو یہی ان کی قیمت ہے اس پر وہ شخص عرض کرے گا خدایا! میں نے معاف کر دیا تب وہ ارحم الراحمین اس شخص کو حکم دے گا کہ جاؤ اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ لو اور اس کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حضور علیہ السلام نے اس تقریر عالی کے بعد فرمایا اتقوا اللہ واصلحو ذات بینکم فان اللہ تعالیٰ یصلح بین المومنین یوم القیمۃ یعنی اللہ سے ڈرو اور فیمابین اصلاح کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہل ایمان باہم میں اصلاح کرے گا۔

مذکورہ بالا مثال سے واضح ہو گیا ہے کہ اس قسم کا انصاف و انتصاف بجز حضرت رب العزت کے کسی مخلوق کی وسعت میں نہیں ہاں عبد کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے نفس سے انصاف لے اور پھر کسی غیر کا کسی غیر سے اور اپنے نفس کا انصاف کسی غیر سے ہرگز نہ لے بلکہ عفو پر کاربند ہو چنانچہ حضور علیہ السلام کی نسبت مروی ہے کہ کبھی آپ نے

toobaa-elibrary.blogspot.com

باوجود قدرت ذاتی انتقام کسی سے بھی نہیں لیا تھا۔

خاصیت

اس کی مداومت سے عبادت میں وسوسہ نہ آئے۔

اَلْجَامِعُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ اور پھر فرمایا يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ جمع کے معنے لغت میں اکٹھا کرنے کے ہیں اور اس اسم کی توجیہ مختلف طریق پر کی گئی ہے۔

(ا) متماثلات کا جمع کرنا جیسے افراد انسانی کا روئے زمین پر اسنا اور نہیں قیامت کے دن میدان حشر میں اکٹھا کرنا۔

(ب) متبائنات کا جمع کرنا جیسے۔ افلاک' نجوم' ہوا' سمندر' حیوانات' نباتات' معادن وغیرہ کو ایک عالم میں جمع کرنا یا ہڈی' رگوں' پٹھوں' گوشت اور خون کو ایک بدن میں قائم کرنا۔

(ج) متضادات کو جمع کرنا مثلاً حرارت' برودت' رطوبت' یبوست کو یکجا جمع کرنا اور یہ صورت بظاہر نہایت دشوار بلکہ انسانی طاقت سے خارج ہے یا متضاد خواہشات کے دلوں کو ایک غرض مشترکہ پر لے آنا کما قال وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ بہر صورت مذکورہ بالا سب توجیہات صحیح ہیں اور سب کی سب اسم جامع کے مفہوم میں داخل ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ ظواہر احکام شریعت کے ساتھ حقائق و معارف طریقت کو بھی جمع کر لیتا ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ جامع وہ ذات مقدس ہے جو اپنے اولیاء کے قلوب کو شہود عظمت کے مقام پر پہنچا دیتا ہے اور ملاحظہ اغیار سے انہیں محفوظ رکھتا ہے۔

خاصیت

اس کی مداومت سے اپنے مقاصد و احباب سے مجتمع رہے اور جس کی کوئی چیز گم ہو جاوے اس کو پڑھے تو مل جاوے۔

اَلْغَنِیُّ الْمُغْنِیُ

جل جلالہ جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ جو موجود اپنی ذات یا کمال ذات میں کسی طور پر بھی غیر کی طرف محتاج ہو وہ ہرگز غنی نہیں ہو سکتا اور جب غنی نہیں تو اس کا مغنی ہونا ناممکن ہے چونکہ ذات باری واجب الوجود ہے اس لئے وہ کسی جہت سے اپنے ماسوا کا محتاج نہیں لہذا وہ غنی ہے اور چونکہ تمام موجودات اور کمالات کا فیضان اس کی طرف سے ہوتا ہے اس لئے وہ غنی بھی ہے غیر اللہ کے حق میں یہ مقصود نہیں کہ وہ مالکیت احتیاج سے بری ہو جائے ہاں عبد کامل کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کا مقصد حقیقی بجز ذات باری کے کوئی چیز نہ ہو اور اس لئے وہ ہر ایک چیز سے مستغنی ہو سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ سے کبھی کوئی مستغنی نہیں ہو سکتا ایسی حالت میں انسان کو غنی کہہ سکتے ہیں قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اور عبد کامل کا بجز ذات باری کے ہر ایک چیز سے مستغنی ہونا ممکن ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے مغنی ہونے کے کچھ معنے نہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

خاصیت

الغنی

کسی مرض یا بلا کے وقت پڑھے تو جاتا رہے۔

المغنی

ہزار بار پڑھے تو تونگری حاصل ہو اور مشغولی جماع کے وقت خیال سے پڑھے تو بیوی اس سے محبت کرنے لگے۔

اَلْمَانِعُ

جل جلالہ

منع کے معنے لغت میں روکنے کے ہیں اور مانع وہ ذات ہے جو دین اور بدن میں ہلاکت و نقصان پیدا کرنے والے اسباب کو رد کرے اور اسباب سے مراد وہ امور ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے سلسلہ حوادث میں خاص مصالح کے لئے پیدا کر دیا ہے اسم حفیظ کی حقیقت اسم مانع کے قریب قریب ہے مگر ان ہر دو میں فرق یہ ہے کہ منع کا مفہوم سبب مہلک کی طرف منسوب ہوتا ہے اور حفظ کا مفہوم محفوظ یا محروس کی طرف کیونکہ وہ مقصود بالمنع ہے اس لئے ہر ایک حفیظ واضح مانع ہو گا مگر ہر ایک مانع حافظ نہیں ہو سکتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ایسے اسباب کا جو موجب نقصان دین یا ہلاک ایمان ہوں نگران رہتا ہے۔

خاصیت

جو اپنی مراد تک نہ پہنچ سکے اس کو صبح و شام پڑھا کرے مراد حاصل ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

الضَّارُّ النَّافِعُ

جل جلالہ - جل جلالہ

یہ ہر دو صفات ذات باری کے کمالات میں داخل ہیں اور ان کا نفی کرنا اس کی ذات کے لئے موجب عیب ہے اور ان ہر دو کو اکٹھا بیان کرنا ضروری ہے جس طرح اسماء مذل و معز کو

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ضار و نافع وہ ذات ہے جس سے خیر و شر اور نفع و ضرر صادر ہو اور یہ امر بجز ذات باری کے کسی مخلوق کو حاصل نہیں قال اللہ تعالیٰ قُلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ مگر جو امر قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ نفع و ضرر کے اسباب عالم کائنات میں مختلف ہیں مثلاً ملک' انسان' شیطان اور جمادات فلک' نجوم وغیرہ اور یہ سب اسباب بالواسطہ یا بلاواسطہ ذات باری کی طرف منسوب ہیں اور کوئی چیز ان میں سے مان مستقل موثر نہیں چنانچہ زہر کی نسبت کبھی یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بذاتہ مضر ہے اور طعام بعضہ موجب سیری ہے بلکہ یہ تمام سلسلہ اسباب زمینی و آسمانی ظاہری و باطنی اس مالک الملک قادر مطلق کی تسخیر و اطاعت میں مضبوط و مستحکم ہے اور یہ ضبط و استحکام اس کی قدرت ازلی کا نتیجہ ہے مگر عام

لوگ اس سلسلہ اسباب کو قدرت ازلی سے اس طرح تعلق دیا کرتے ہیں جس طرح قلم کو کاتب سے یا اگر بادشاہ کسی کاتب کو کسی فرمان انعام یا عقوبت کے لکھنے کا حکم دے تو کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ قلم اس انعام یا عقوبت کا حقیقی سبب ہے اور نہ کاتب کو بلکہ بادشاہ کی ذات پر پہنچ کر عوام الناس رہ جائیں گے مگر ایک صاحب بصیرت جو ارادہ کو مظاہر کائنات میں موثر دیکھ رہا ہے وہ قلم اور کاتب اور بادشاہ کو ذات باری عزاسمہ کے ارادہ و قدرت کی تسخیر و اطاعت سے وابستہ دیکھتا ہے کیونکہ یہ درمیانی وسائط بطور قانون طبعی (لفظ قانون طبعی سے اس امر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب کاتب اور قدرت کتابت اور ارادہ کتابت اور عزم صادق مجتمع ہو جائیں اور ارادہ ازلی دوبارہ کتابت جاری ہو چکا ہو تو کچھ شک نہیں کہ فعل کتابت واقع ہو کر رہے گا) کے سبب اسی ذات کی' مخلوق و مقہور ہیں اس تقریر سے صاف معلوم ہو گیا کہ حقیقی طور پر ضار اور نافع وہی ذات حقیقی ہے۔

ذات باری کا ضار و نافع ہونا دینی و دنیوی حالات میں یکساں طور پر جاری ہے مثلاً ہدایت و ضلالت اور غنا و فقر اور صحت و مرض وغیرہ کے اسباب براہ مظاہر عالم میں عمل کر رہے ہیں چنانچہ اہل بصیرت کو خوب معلوم ہے کہ یہ اسباب خاصاً ارادہ ذات باری کے ماتحت جاری ہیں پس صحیح الایمان آدمی ہمیشہ حوادث کو براہ راست ذات باری کی طرف منسوب کرتا ہے اور وسائط کو نظر انداز کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص کبھی نزول حوادث پر جزع و فزع نہیں کرتا برخلاف جاہل اور بد اعتقاد آدمی کے کہ وہ اسباب کو علت موثرہ سمجھ کر رجوع الی اللہ نہیں کرتا۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ اعداء اللہ کے حق میں ضار اور اولیاء اللہ کے حق میں نافع ثابت ہوتا ہے قال اللہ تعالیٰ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ اور پھر فرمایا اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ مگر ایسے عبد کامل کا شدت حق کفار اور رحمت حق ابرار بنا محض

toobaa-elibrary.blogspot.com

اللہ تعالیٰ کی رضا پر مبنی ہوتا ہے نہ اس کی خواہش نفس پر اور نیز ایسا شخص نہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر سے ڈرتا ہے اور نہ کسی سے امیدوار ہوتا ہے بلکہ ہر حالت میں اس کا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں یہ کلمات لکھے تھے انا اللہ الذی لا الہ الا انا من لم یستسلم لقضائی ولم یصبر علی بلائی ولم یشکر لنعمائی فلیطلب ربا سوائی یعنی میں خدائے وحدہ لاشریک ہوں جو شخص میرے حکم ازلی کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا اور میری بھیجی ہوئی مصیبت پر صابر نہیں ہوتا اور میری دی ہوئی نعمت کا شکر نہیں کرتا اسے چاہیے کہ مجھے چھوڑ کر کسی اور کو اپنا پروردگار بنا لے۔

بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جناب باری میں درد دندان کی شکایت کی حکم ہوا کہ فلاں بوٹی کا استعمال کرو چنانچہ آپ نے اس بوٹی کو استعمال کیا اور درد نے افاقہ ہو گیا پھر کچھ مدت کے بعد دوبارہ درد نے عود کیا اور آپ نے اس بوٹی کا استعمال کیا مگر درد نہ رکا آپ نے جناب رب العالمین میں عرض کیا کہ خدایا تو نے مجھے فلاں بوٹی کے استعمال کا حکم دیا تھا مگر درد بند نہیں ہوا جواب ملا کہ شفاء عافیت اور ضرر و نفع ہمارے ہاتھ میں ہے کوئی چیز ہمارے حکم کے بغیر نہ ضرر دے سکتی ہے نہ نفع۔ پہلی دفعہ تم نے ہماری طرف رجوع کیا تھا ہم نے تمہاری تکلیف کو دفع کر دیا دوسری دفعہ تم نے بوٹی کو ازالہ مرض کا سبب سمجھا اور ہمیں چھوڑ دیا۔

حضرت مشائخ کرام لکھتے ہیں کہ ضار وہ ذات ہے جو کفار پر ارادہ ازلی کے مطابق ضرر عائد کرے اور ابرار کو مشیت ازلی کے مطابق نفع پہنچائے بعض لکھتے ہیں کہ ضار وہ ذات ہے جو اہل عصیان کو محروم رکھے اور نافع وہ ذات ہے جو اہل اطاعت کو مورد احسان بنائے ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ تین امور منجملہ اعمال رضا شمار ہوتے ہیں قبل جریان قضاء ترک اختیار اور بعد جریان قضاء عدم کراہت اور نزول بلا پر ترقی محبت۔

خاصیت

الضار

شب جمعہ میں سو بار پڑھے ضرر سے محفوظ رہے۔

النافع

جس چیز سے نفع حاصل کرنا ہو اس کو دل سے پڑھے

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلنُّوْرُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عام طور پر نور اس کیفیت سے مراد ہے جو ضد ظلمت ہے مگر اس معنی کی رو سے ذات باری پر اس اسم کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کیفیت حادث ہے جو موجود ہو کر زائل ہو جاتی ہے اور ذات باری حدوث سے بری ہے مع ہذا یہ کیفیت قائم بالجسم ہوتی ہے اور قیام بالغیر منافی وجوب ہے اور ذات باری واجب الوجود ہے نیز یہ کیفیت بالنسبۃ الی الظلمۃ ایک امر اضافی ہے اور ذات باری اضافت سے پاک ہے۔

مسطورہ بالا آیت کی تفسیر میں حضرات مفسرین نے مختلف اقوال قلمبند کئے ہیں مثلاً

(ا) نور وہ حقیقت ہے جس پر تمام اشیاء مخفیہ ظاہر ہوں اور خفاء فی الحقیقت عدم کا نام ہے اور ظہور وجود کو ہوتے ہیں اور ذات باری موجود ہے جس پر عدم کا عائد ہونا محال ہے اور چونکہ ذات باری تمام موجودات کی خالق ہے اس لئے وہی ہر ایک ظلمت ظہور کا نور بلکہ نور الانوار ہے۔

(ب) نور سے مراد منور (روشن کنندہ) ہے۔

(ج) لفظ نور سے بعض اوقات ایسے سبب سے مراد لیا کرتے ہیں جو نظم مصالح اور اصلاح امور کا باعث ہو چنانچہ یوں کہہ سکتے ہیں فلاں نور البلدۃ یعنی اس کی ذات سے انتظام مصالح وابستہ ہے اس لئے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ سلسلہ نظام کائنات کا قائم رکھنے والا ہے۔

لیکن اس اسم کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ نور وجود کا مترادف ہے یہ مستلزم ظہور ہے اور وجود تمام اشیاء کا ذات باری سے ظاہر ہو، جس طرح نور آفتاب کا ایک ذرہ وجود آفتاب پر دلیل ہے اسی طرح ایک ایک ذرہ کائنات کا اپنے موجد حقیقی کے وجود کا شاہد ہے۔

انسان کامل کو اس اسم سے یہ بہرہ ہوتا ہے کہ اس کو معرفت الٰہی کا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور یہ معرفت ایک نور ہے جو قلب مومن میں پیدا ہوتا ہے وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ نور وہ ذات ہے جو اہل صدق کے قلوب کو نور توحید سے اور اہل محبت کے باطن کو تائید ازلی سے بھر دیتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نور وہ ذات ہے جو قلوب عارفین کو نور معرفت سے اور نفوس عابدین کو نور عبادت سے زندہ کرتی ہے۔

خاصیت اس کے ذکر سے نور قلب حاصل ہو۔

دعاء اللهم لك الحمد انت نور السموات والارض ولك الحمد انت قيام السموات والارض ولك الحمد انت رب السموات والارض ومن فيهن انت الحق و وعدك الحق ولقاءك حق والجنة حق والنار حق والساعة حق اللهم لك اسلمت وبك امنت وعليك توكلت واليك انبت وبك خاصمت واليك حاكمت فاغفرلي ماقدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت انت الهي لا اله الا انت (ترمذی)

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْهَادِیُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ لَهَادِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اسم ہادی مشتق ہے مصدر ہدایت سے جس کے معنے رہنمائی کے ہیں اور ہدایت کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے۔ (ا) کسی کو راستہ دکھلا دینا (ب) کسی کو مطلوب تک پہنچا دینا اور قرآن مجید میں انھیں ہر دو معنے میں اس کا استعمال کیا گیا ہے۔

ذات باری کا ہادی ہونا مختلف طریق پر اعتبار کیا جا سکتا ہے مثلاً یہ کہ وہ اپنے اخص بندگان کو اپنی معرفت اور نور توحید سے خصوصیت بخشتا ہے کما قال وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ نیز ہر ایک مخلوق کو ایک فطرت لائقہ پر پیدا کر کے اس کو جلب منفعت اور دفع مضرت کی ہدایت کرتا ہے کما قال رَبُّنَا الَّذِيْ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى مع ہذا اس کا ہادی ہونا یوں بھی صحیح ہے کہ وہ اپنے کلام سے جو انبیاء پر نازل فرماتا ہے بندوں پر طریق حق واضح کرتا ہے اور دلائل حقہ پر آگاہ کرتا ہے۔

نوع انسان میں سے وہ لوگ ہادی ہو سکتے ہیں جو عوام الناس کو سعادت اخروی کی طرف دعوت کریں اور انھیں صراط مستقیم پر چلائیں اور وہ بزرگ گروہ

حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ہے اور ان کے بعد علمائے راسخون فی العلم کا جو ورثۃ الانبیاء کہلاتے ہیں اور در حقیقت اس صورت میں بھی ذات باری ہی ہادی ہے کیونکہ انبیاء و علماء بھی اللہ تعالیٰ کے حکم و ارادہ کے زیر تسخیر ہوتے ہیں۔

حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ ہادی وہ ذات ہے جو قلوب کو اپنی معرفت اور نفوس کو اپنی اطاعت کی راہ دکھائے اور بعض لکھتے ہیں کہ ہادی وہ ذات ہے جو اہل معصیت کو توبہ اور اہل معرفت کو حقیقت قرب کی ہدایت کرتا ہے۔

خاصیت

اس کے ذکر سے یا لکھ کر پاس رکھنے سے بصیرت اور فہم صحیح پیدا ہو۔ اہل حکومت کے لئے بھی مناسب ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْبَدِیْعُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس اسم کی تفسیر دو طرح پر کی گئی ہے اول تو یہ کہ بدیع وہ ذات ہے جس کی نظیر یا مثل موجود نہ ہو چنانچہ کسی عدیم النظیر چیز کی نسبت بول دیا کرتے ہیں ھذا شیء بدیع سو جب کسی ممکن چیز کی نسبت اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے تو ذات باری کی نسبت بدرجہ اولیٰ اس کا اطلاق ہو سکتا ہے کیونکہ ازل سے ابد تک اس کی نظیر یا شبیہ کا وجود ممتنع ہے دوم یہ کہ بدیع بمعنی مبدع ہے جیسے فعیل بمعنی مفعل مگر بدع فعل ثلاثی کی تصریف اہل زبان کے ہاں مستعمل نہیں ہوئی اس صورت میں بدیع وہ ذات ہو گی جو مخلوقات کو ابتداء بلا سابقہ مثال کی تقلید کے پیدا کرے کوئی توجیہ ہو یہ اسم مطلقاً بجز ذات باری کے کسی مخلوق پر اطلاق نہیں کیا جا سکتا ہاں عبد کامل جو صفات نبوت یا دلائت یا علم میں کسی خصوصیت کے لحاظ سے بے نظیر ہو وہ مجازاً اس اسم کا مصداق ہو سکتا ہے خواہ اس کا بے نظیر ہونا جمیع ازمنہ ثلاثہ میں ہو یا صرف اس کے اپنے زمانہ میں۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ بدیع وہ ذات ہے جو عجائب صنعت اور غرائب حکمت کو ظاہر کر سکے۔

خاصیت

اس کو ہزار بار پڑھے تو حاجت پوری ہو اور ضرر دفع ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْبَاقِیُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَاللّٰہُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی ذات باری واجب الوجود ہے اس لئے اس کا وجود ازلی و ابدی ہے جب اس کے وجود کو ازل کی طرف نسبت کرتے ہیں تو قدیم اور جب ابد کی طرف منسوب کریں تو اسے باقی کہتے ہیں اور واجب الوجود ہر دو جہت نسبت پر حاوی ہے اس نسبت ماضی و مستقبل سے یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ ذات باری کا جریان ہو سکتا ہے کیونکہ زمانہ صرف حادث شے پر جاری ہوتا ہے جس پر تغیر و انقلاب کا عارض ہونا ممکن ہے اور ذات باری تغیر و انقلاب سے بری ہے بلکہ وہ قبل از زمان اور بعد از زمان یکساں حالت پر قائم ہے یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بقاء ذات باری اس کی ذات سے کوئی زائد وصف نہیں ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو کیونکہ اس صورت میں دور و تسلسل لازم آتے ہیں جو باطل ہیں۔

بعض محققین نے لکھا ہے کہ باقی وہ ذات ہے جو اول بلا ابتداء اور آخر بلا انتہا ہو محقق نصر آبادی لکھتے ہیں کہ ذات حق اپنی ذاتی بقاء کے ساتھ اور جمیع مخلوقات اس کے فیض بقاء کے ساتھ قائم ہے انسان کامل جب لوازم بشریت

سے علیحدہ ہو کر منازل سلوک کو پورا کر لیتا ہے تو وہ بقائے دوام کا رتبہ پا لیتا ہے اور حیوۃ طیبہ کا مالک ہو جاتا ہے اس صورت میں اس کے ہیکل عنصری کیساتھ موجود رہنے اور اس کو ترک کر دینے میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ قال اللہ تعالیٰ فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ

خاصیت

ہزار بار پڑھے تو ضرور غم سے خلاصی ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلْوَارِثُ

جل جلالہ

قال اللہ تعالیٰ وَهُوَ خَيْرُ الْوَارِثِيْنَ اور پھر فرمایا وَنَحْنُ الْوَارِثُوْنَ اہل بصیرت جو حقیقت توحید سے آگاہ ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ ملک وملکوت کا ایک ایک ذرہ اس وحدہ لاشریک کے قبضہ قدرت میں قائم ہے اور ایک لحظہ بھر کے لئے اس کے اقتدار و تصرف سے خارج نہیں ہو سکتا ہاں اس نے انتظام عالم کے قائم رکھنے کے لئے محض اپنے فضل و کرم سے عارضی طور پر اپنے بندوں کو بعض اشیاء کا مالک بنا رکھا ہے مگر جب وعدہ ازلی کے مطابق سلسلہ عالم کا خاتمہ ہو جائے گا اور عارضی مالک و مملوک کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا تو حقیقت توحید کے اثبات و اظہار کے لئے وہی مالک حقیقی ندا کرے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ چونکہ بجز اس کی ذات کے تمام نسبتیں مالکیت و مملوکیت کی منقطع ہو جائیں گی خود ہی جواب دیں گے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ذات باری کے اس سوال و جواب کی حقیقت اہل توحید پر آج ہی منکشف ہے کیونکہ وہ عالم کو وصف فنا کے ساتھ متصف دیکھتے ہیں اور بقاء ذات باری اور اس کی حقیقت مالکیت کو اسی طرح مشاہدہ کر رہے ہیں جس طرح اہل

ظاہر قیامت کے دن کھلم کھلا مشاہدہ کریں گے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ وارث وہ ذات ہے جو کسی دوسرے کی طرف سے صاحب وراثت نہ ہو بلکہ ذاتی طور پر صاحب تصرف و اختیار ہو بعض لکھتے ہیں کہ وارث وہ ذات ہے جس نے بے نیازی کا جامہ پہنا ہو اور اپنی حقیقی وحدت میں یگانہ ہو۔

انسان کامل جب اسرار معرفت پر حاوی ہو جاتا ہے تو وہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم کا وارث بن جاتا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء کے یہی صحیح معنے ہیں اور جب حضرات انبیاء علیہم السلام کے مدارج علوم پر ترقی کرتا ہے تو تخلقوا باخلاق اللہ وہ اسم وارث کا مظہر کامل بن جاتا ہے۔

خاصیت

درمیان مغرب و عشاء کے ہزار بار پڑھے تو حیرت دفع ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلرَّشِیْدُ

جل جلالہ

یہ اسم قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا۔ رشد مصدر سے مشتق ہے جو غی (ضلالت) کی ضد ہے اور جس کے معنے استقامت کے ہیں۔ اس کی توجیہ دو طرح پر ہو سکتی ہے اول تو یہ کہ رشید بمعنی راشد ہے جس کے معنے حکیم کے ہیں یعنی ایسی ذات جس کے افعال میں عبث و باطل کو دخل نہیں دوم فعیل بمعنی مفعل یعنی رشید بمعنی مرشد اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ رشید وہ ذات ہے جو ہر ایک مخلوق کو اس کی فطرت کے مطابق اس کی مصلحت کی طرف ہدایت کرے۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کی تدبیرات بلا کسی مشیر کے عین صواب ہوں اور یہ امر بجز ذات باری کے کسی کو حاصل نہیں بعض لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کو چاہے سعید بنا دے یا شقی بنا دے اور بعض لکھتے ہیں کہ رشید وہ ذات ہے جس کی تدبیر میں سہو اور تقدیر میں لہو کو کچھ دخل نہ ہو۔

انسان کامل کا رشید ہونا اسی قدر زیادہ صحیح ہو گا جس قدر وہ اپنے دینی و

دنیوی مقاصد میں عین ہدایت پر کاربند ہو

خاصیت

بعد نماز عشاء کے سو بار پڑھے تو عمل مقبول ہو۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

اَلصَّبُوْرُ

جل جلالہ

یہ اسم بھی قرآن مجید میں وارد نہیں ہوا صبر مصدر سے مشتق ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں اور اس کا مفہوم قریب قریب اسم حلیم کے ہے مگر حلیم میں امن اور عقوبت کا مفہوم زیادہ قوی ہے۔

امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جو قبل از وقت فعل کے جا لانے میں جلدی نہ کرے۔ بلکہ قانون ضروری کے مطابق ایسے وقت معلوم پر ملتوی رکھے جو غفلت و کسل کی آمیزش سے بالکل پاک ہو مگر یہ التوا ایسا نہ ہو جس کے ساتھ مخالف جانب کی کشش بھی لگی ہو کیونکہ یہ صورت نسانی صبر کی ہے جس میں داعیہ نفس انسان کو جلد بازی پر ابھارتا ہے اور وہ نفس کا مقابلہ کر کے جانب مخالف سے باز رہتا ہے اور انسان اس وقت وصف صبر سے متصف ہوتا ہے جبکہ داعیہ نفس کو مغلوب و مقہور کر سکے مگر یہ بات بجز مجاہدہ نفس کے حاصل نہیں ہو سکتی صبر کے مختلف مراتب ہیں لہذا ہر میں مقابلہ نفس کرتے وقت سخت تکلیف ہوتی ہے مگر بتدریج یہ بات آسان ہو جاتی ہے۔

حضرات مشائخ لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جس کو بندہ کی کثرت معصیت کثرت عقوبت پر آمادہ نہ کرے اور بعض لکھتے ہیں کہ صبور وہ ذات ہے جو جفاء کا مقابلہ عطاء اور عصیان کا مقابلہ غفران کے ساتھ کرے۔

ابوبکر وراق رحمتہ اللہ لکھتے ہیں کہ اپنے اور بندوں کے درمیان صدق اور اپنے اور نفس کے درمیان صبر کے ساتھ استقامت کرو اور اسی امر کو نجات اخروی کا مدار سمجھو۔ فقط

خاصیت

آفتاب طلوع ہونے سے پہلے سو بار پڑھا کرے تو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اور کتابوں میں اور بھی بے شمار خواص مذکور ہیں مگر اخلاص و اعتقاد کے ساتھ اس قدر بھی کافی ہے۔

هذا اخر كلامنا في مبحث الاسماء

toobaa-elibrary.blogspot.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

توحید ذات باری کی حقیقت کا سمجھنا اسماء و صفات کے معانی کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ قرآن مجید میں جن اسماء و صفات کا ذکر کیا ہے وہ سب کے سب علیحدہ علیحدہ مختلف مسائل علم عقائد کے لئے بمنزلہ اصل اصول کے ہیں۔ سلف صالحین ان اسماء و صفات کے معانی کو خوب سمجھتے اور اس لئے انہیں علیحدہ علم عقائد کی تعلیم کی ضرورت نہ پڑتی اسلام میں جس قدر عقائد تسلیم کیے گئے ہیں ان کا منبع یہی اسماء و صفات ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک اسماء و صفات کا علم نہ ہو۔ کوئی شخص عقائد صحیحہ حاصل نہیں کر سکتا اور نہ معانی آیات کے سمجھنے کی اس کو قدرت ہو سکتی ہے چونکہ موجودہ زمانہ میں لوگوں کی ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اور حقائق علیہ کے سمجھنے پر محنت اور وقت کا صرف کرنا دشوار ہو گیا ہے لہذا خاکسار نے برادران اسلام کی دینی خدمت کو مد نظر رکھ کر بطور اختصار اسماء و صفات ذات باری کی یہ شرح لکھی ہے تاکہ انہیں بہت سے مذہبی مسائل مشکلہ کے حل کرنے میں مفید ثابت ہو۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسماء و صفات کی علمی تحقیق کو لفظوں میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ حقائق جن کا انکشاف تصفیہ و تزکیہ باطن پر موقوف ہے اور جو محض وجدان سلیم اور ذوق صحیح سے حاصل ہوتے ہیں بذریعہ الفاظ ظاہر کئے جائیں کیونکہ یہ بات صرف صاحب مقام ہونے پر منحصر ہے اور صاحب مقام لاکھوں میں سے کوئی ایک تو ہو ہی سکتا ہے ہر ایک ہوسناک کو یہ پایہ نصیب نہیں ہوتا۔

اگر ژالہ ہر قطرہ در شدے　　چو خرمہرہ بازار باپر شدے

ہاں یہ ممکن ہے۔ کہ اگر کسی سعادت مند کو توفیق ازلی یاور ہو۔ اور روش صالحین کی محبت اس کے دل میں جاگزین ہو جائے تو شوق طلب اس کو انہیں حضرات کے ساتھ وابستہ کر دے۔

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد
دست در پائے کبوتر زدو ناگاہ رسید

حق یہ ہے کہ محبت صالحین انسان کو صالح بنا دیتی ہے کیونکہ بموجب فرمان حضرت نبوی المرء مع من احب قیامت کے دن انہیں لوگوں کے زمرہ میں مبعوث ہو گا۔ جن کی محبت اور جن کے طریق کو وہ پسند رکھتا ہے۔ یہ کبھی ہو نہیں سکتا کہ اہل سعادت کا دامن پکڑ کر کوئی شخص منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے ہاں حسن ارادت شرط ہے کیونکہ بے طلب صادق کبھی کچھ نہیں پایا کرتا۔

عاشق کہ شد کہ یار حالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

اس حسن ارادت کے ساتھ حسن ادب بھی شرط ہے کیونکہ بے ادب آدمی جو سوء ظن کے مرض میں مبتلا ہوتا ہے ہمیشہ محروم رہا کرتا ہے کما قلت فی ذالک

ادب گزیں کہ نہ شد لقمہ زیں خواں
بسا کسے کہ نشد بر آستان گستاخ

مجھے یہ خیال تھا کہ میں اس موضوع پر کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کروں گا مگر بعد میں بوجوہ چند ایجاز و اختصار کو مد نظر رکھنا ضروری معلوم ہوا کیونکہ عام طبائع مباحث دقیقہ سے مستفید نہیں ہوتیں جہاں کوئی مشکل بحث شروع ہو گئی کتاب کو بند کیا اور وہیں کی وہیں طاق نسیان میں پڑی رہی۔

عربی میں اسماء و صفات ذات باری پر بہت سی کتب و رسائل موجود ہیں۔ ہر ایک کا طرز بیان جدا ہے۔ اور کسی نہ کسی پہلو میں مفید مگر میری نظر سے جس قدر کتابیں اس موضوع کی گذری ہیں۔ ان میں سے حضرت امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب المقصد الاسنے اور فخر المتکلمین امام رازی علیہ الرحمۃ کی کتاب لوامع البینات زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ لہذا انہیں کو اس رسالہ کا ماخذ تصور کرنا چاہیے۔ اگرچہ دو تین اور کتابیں بھی لکھتے وقت میری زیر نظر تھیں ان ہر دو بزرگوار کی تصانیف سے جدا جدا ان کے اپنے مقامات قلب کا پایہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ ان ہر دو کتب سے بھی صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

حضرت غزالی بحر عرفان میں مستغرق ہیں اور امام رازی عقلیات کے میدان میں چل رہے ہیں اگرچہ کہیں کہیں اصحاب ذوق و وجدان کی روش بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ یہ مقام حضرت غزالی ہی کا ہے۔ رازی ہیئت علوم میں بڑا پایہ رکھتے ہیں مگر غزالی میدان ریاضت و مجاہدت میں بہت دور نکل گئے ہیں۔ لہذا ان کا کلام ایک خاص صاحب حال کا کلام ہے۔ رازی جا جا ان کی کتاب مذکور کا حوالہ دیتے ہیں اور امام صاحب کا نام نہایت معزز الفاظ میں لیتے ہیں فرحمہما اللہ تعالیٰ شرح اسماء و صفات سے پہلے چند ایسے مسائل کا قلمبند کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کا سمجھنا اس رسالہ کے مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔ وما انا اشرع فی المقصود متوکلاً علی الرب المعبود ھو حسبی و نعم الوکیل

اسماء و صفات منبع جمیع عقائد حقہ ہیں

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اسماء و صفات جمیع عقائد اسلامیہ کا منبع ہیں لہذا اہل السنت والجماعت اکثر ہم اللہ تعالیٰ مسئلہ اسماء و صفات کو معرفت ذات باری کا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور کبھی مسلک اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے برخلاف دیگر اسلامی بدعتی فرقوں کے جن کا مدار عقائد علوم عقلیہ پر ہے۔ اور کتاب و سنت میں تاویلات باطلہ کر کے اپنے مسلمات کو ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یہ مسلم ہے کہ جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ عزت دینی اور راحت دنیوی دینا چاہتا ہے اور اپنی معرفت کی طرف بلاتا ہے تو اس کا سینہ قبول حق کے لئے کھول دیا جاتا ہے اور انوار نبوت سے تمام معتقدات حقہ کو حاصل کرتا ہے یہی امر نشان سعادت ہے اور یہی عافیت دارین کا موجب ہوتا ہے۔

این نعمت میدہی بہر دل مند ہند
وین نزل خشکان منزل مند ہند
در عالم عشق آنچہ بے عقلاں راست

یک ذرہ بصد ہزار عاقل مند ہند

اہل حق مسئلہ صفات میں جو علم عقائد میں نہایت دقیق مسئلہ ہے ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ اور صفات ذات باری کو جو کتاب و سنت میں وارد ہو چکی ہے تعریفات وحی سمجھتے رہے ہیں اور اس اصل عظیم کو شفاء روحانی کا واسطہ سمجھ کر مورد تجلیات ہوتے رہے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی علم کا شریف ہونا اس علم کی غایت کے شریف ہونے پر مبنی ہے چونکہ اسماء و صفات کا علم حصول معرفت الٰہی کا ذریعہ ہے لہذا اس علم سے بڑھ کر اور کوئی علم ضروری نہیں ہو سکتا کیونکہ معرفت ذات باری بقدر حوصلہ بشری ہر ایک انسان کا فرض ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى جس قدر جسم انسانی کو غذا کی ضرورت ہے اس سے بڑھ کر روح کو ان معارف حقہ کی ضرورت ہے جو بمنزلہ غذاء روح ہیں جو شخص معارف حقہ سے بے بہرہ اور ذوق سلیم سے بے نصیب ہے وہ عارفان خدا کی اصطلاح میں مردہ ہے۔ وھی الجھل قبل الموت موت لاھلہ اس لئے جس قدر کسی شخص کو اسماء و صفات کا زیادہ علم ہو گا اسی قدر معرفت ذات باری میں زیادہ ممتاز ہو گا اور جس قدر زیادہ معرفت کا مالک ہو گا اسی قدر زیادہ مقرب حضرت باری ہو گا اور جس قدر کوئی شخص حقیقت اسماء و صفات سے جاہل ہو گا اسی قدر لذت ذکر سے ناآشنا ہو گا بلکہ اسے نفرت و کراہت ہو گی یہ بالکل صحیح ہے کہ کوئی ذکر مسنون ایسا نہیں جس میں اسماء و صفات نہ آئے ہوں پس لذت ذکر کے کامل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسماء و صفات کے معانی حقیقیہ کا علم حاصل کیا جائے کیونکہ اسماء و صفات بمنزلہ تعریف کے ہیں (تعریف سے یہاں منطقی اصطلاح مراد نہیں ہے بلکہ لغوی مفہوم مراد ہے) اور تعریف ذات باری سے عظمت کا خیال پیدا ہوتا ہے اور عظمت ہے محبت اور محبت تمام ترقیات کے لئے اصل عظیم ہے جب ذکر اس طریق سے کیا جاتا ہے تو کثرت ذکر ذاکر کو انواع و اقسام کی تجلیات کا مورد بنا دیتی ہے اور پھر کبھی غفلت نہیں ہوتی بلکہ دوام ذکر کا رتبہ جو تعلیم وحی کا مقصد اعلیٰ ہے حاصل ہو

toobaa-elibrary.blogspot.com

جاتا ہے اور قلب کو بے اختیارانہ محبت کا مقام نصیب ہوتا ہے کما قیل۔

واذا تقاضیت الفواد تناسیاً　　الفیت احشائی بذاک شحاحاً

جب میں اپنے دل سے اس کی یاد بھلا دینا چاہتا ہوں تو وہ اس بارے میں بخیل ثابت ہوتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں چونکہ عقائد میں رائے زنی کا ہر ایک شخص مدعی ہے۔ اور کتاب و سنت کو بالائے طاق رکھ کر ملاحدہ و فلاسفہ کی پیروی کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور عقائد دین پر نکتہ چینی کرنے کو کمال علمی تصور کرتا ہے اس لئے ہر ایک خالص الایمان کو اس بات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ عقائد صحیحہ کو کتاب و سنت سے اخذ کرے۔ مسلک اہل السنت سے سر مو تجاوز نہ کرے اور مسئلہ صفات میں بڑی احتیاط سے کام لے کیونکہ جس قدر الحاد و زندقہ آج تک اسلامی فرقوں میں پھیلا ہے۔ صرف مسئلہ صفات میں بے لگامی کا نتیجہ ہے آج کل نیچریت اور دہریت کی گرم بازاری ہے اور یہ الحاد صرف مسئلہ صفات میں بے اعتدالی کرنے کا نتیجہ ہے عام طور پر مغربی تعلیم کے لوگ اس الحاد میں مبتلا ہیں اور انکار معجزات اور انکار وحی انکار ملائکہ اور انکار حشر اجساد جو عقائد اسلام میں مہتم بالشان عقائد ہیں۔ ان کا معمول و دستور ہے ان لوگوں کے عقائد اوہام فلسفہ کے زنجیروں میں ایسے جکڑے ہوئے ہیں کہ انہیں کتاب و سنت سے ایک گونہ نفرت آتی ہے ہاں بعض لوگ خوف بدنامی کھلم کھلا اپنے عقائد فاسدہ کا اظہار نہیں کرتے مگر دل میں انہیں اس قدر وساوس و شکوک پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ حلاوت ایمان نصیب نہیں ہوتی۔

بعض عارفین (ابو علی رودباری قدس سرہ) نے اسماء ذات باری کی نسبت لکھا ہے اظہر الحق الاسامی وابدھا للخلق لیسکن بہا قلوب المحبین ویونس بہا قلوب العارفین لہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے اسماء شریفہ کا اظہار فرمایا ہے تاکہ اس کے عاشق اور عارف لوگوں کے قلوب سکون اور انس حاصل کر سکیں۔ انہی در حقیقت اسماء و صفات ترقی

معرفت کا ذریعہ ہیں سالک جب صاحب ذکر ہو کر استقلال و استقامت کا مقام حاصل کر لیتا ہے تو انہیں اسماء و صفات کی حقیقت کا انکشاف شروع ہو جاتا ہے جو اصطلاح فن تصوف میں تجلی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ اصطلاح کلام الٰہی سے ماخوذ ہے فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ علمی طور پر اسماء و صفات کا علم ہو چکنے کے بعد جب سالک کو استقامت حاصل ہو جاتی ہے تو کیفیت حالیہ بذریعہ تجلیات وارد ہوتی ہے جس سے مقام یقین میں بتدریج ترقی ہونے لگتی ہے اس مقام میں معتقدات سالک وساوس و شکوک سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور اس تعلق کی حقیقت کھل جاتی ہے جو بظاہر موجودات کے ساتھ اسماء و صفات ذات باری کو حاصل ہے یہی حقیقی عرفان ہے اور اس شخص کو عارف الٰہی کہتے ہیں جو اس تعلق کی کیفیت پر آگاہ ہوتا ہے اس مقام پر عارف کو تمام موجودات زمینی و آسمانی ارادہ الٰہی اور مشیت ازلی کی مغلوب و مقہور معلوم ہوتی ہے اور وہ نور معرفت سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ کس طرح پر صفات باری حوادث کی علت ہیں اور کیونکر ایک زبردست ارادہ تمام ذرات کائنات پر محیط ہے۔ اس مقام پر رابطہ محبت الٰہی مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے اور محب کو عاشق صادق کہلانے کا حق حاصل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے محبوب کے حضور سے ایک آن کے لئے بھی علیحدگی پسند نہیں کرتا بلکہ تمام مصائب و تکالیف کو جو عالم طبیعت میں اس پر عائد ہوتی ہیں مقابلہ وصل محبوب کے آسان سمجھ لیتا ہے یا ان کا اسے احساس ہی نہیں ہوتا اس وقت اس کی حالت ان اشعار کا مصداق ہو جاتی ہے۔

اراک فیمتلی قلبی سروراً
واخشی ان تغیب بک الدیار
فجرو اھجرو صدلا تصلنی
رضیت بان تجور وانت جار

ترجمہ۔ میں تجھے دیکھتا ہوں تو باغ باغ ہو جاتا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ کہیں تو مجھ سے دور چلا جائے ظلم ہجر اعراض جو تیرا دل چاہے مجھے منظور ہے ہاں مگر مجھ

toobaa-elibrary.blogspot.com

سے دور نہ ہو۔

بحث اسم و مسمیٰ

علم کلام میں یہ مسئلہ متنازع فیہ ہے کہ کیا اسم و مسمیٰ ایک ہی حقیقت کا نام ہے یا دونوں مختلف الماہیۃ ہیں جمہور اشاعرہ کا مذہب ہے کہ اسم و مسمیٰ ہر دو ایک ہی حقیقت ہیں اور ان میں کچھ فرق نہیں مگر معتزلہ اس امر کے قائل ہیں کہ اسم و مسمیٰ دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں امام غزالی قدس سرہ کا مذہب بھی یہی ہے کہ اسم و مسمیٰ ایک نہیں اسی مذہب کو امام رازی نے اختیار کیا ہے ابن حزم ظاہری کا مسلک بھی یہی ہے اور فی الحقیقت یہی صحیح بھی ہے جو لوگ اسم و مسمیٰ کو حقیقت واحدہ بتلاتے ہیں وہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ یہاں اسم کا متبارک ہونا آیا ہے اور متبارک ہونا مسمیٰ کی شان ہوتی ہے نہ اسم کی لہذا اسم و مسمیٰ ایک ہی ہیں پھر دوسری جگہ فرمایا سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى اس آیت سے اسم کی تسبیح ظاہر ہوتی ہے حالانکہ تسبیح ذات باری کی ہوا کرتی ہے لہذا اسم و مسمیٰ کو جب تک ایک نہ مانا جاوے معنی صحیح نہیں ہو سکتے اسی قسم کی بعض اور آیات سے بھی تمسک کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے ہرگز اسم و مسمیٰ کا ایک ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اسم واسطہ ذکر ہے جس کے ذریعہ ذات باری کی تنزیہ کی جاتی ہے چونکہ ہر دو میں غایت تعلق ہے اس لئے تنزیہ ذات اور تنزیہ اسم میں کوئی فرق نہیں یہی جواب پہلی آیت کا ہے کیونکہ ذات باری کا اسم بھی موجب خیرات و برکات ہے اس لئے اسم کا متبارک ہونا بالکل صحیح ہے یہ بدیہی امر ہے کہ اسم ایک لفظ ہے جو بذریعہ صوت منہ سے نکالا جاتا ہے اور مسمیٰ ذات کا نام ہے لفظ نار اور وہ چیز جو روشن ہوتی اور جلاتی ہے اگر ایک ہی ہوں تو چاہیے کہ نار کا لفظ بولتے وقت زبان جل جایا کرے۔ مع ھذا اسم و مسمیٰ کے صفات کا علیحدہ علیحدہ ہونا خود اس امر کی پختہ شہادت ہے کہ ہر دو متحد الحقیقت نہیں ہو سکتے مثلاً سیاہ یا

سفید ہونا کسی چیز کی صفت تو ہو سکتا ہے مگر اسم کی جو ایک لفظ ہے ہرگز صفت نہیں ہو سکتا ہاں بعض موقع پر یہ ضروری ہے کہ اسم و مسمیٰ ایک ہی ہوں مثلاً خود لفظ اسم کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اسم ہے نہ فعل و حرف اسم و مسمیٰ کے متحد الحقیقت ہونے پر بعض لوگ لبید کے قول ذیل سے استشہاد کیا کرتے ہیں حیث قال۔

الی الحول ثم اسم السلام علیکما

اس مصرع میں اگر اسم کو عین سلام نہ کہا جائے تو کوئی معنے نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ لبید رضی اللہ عنہ صحابی تھے انہوں نے اپنے کلام میں ہرگز ایسا خیال ظاہر نہیں کیا جو کئی ایک مفاسد کا مستلزم ہو اس مصرع میں سلام یا تو مجملہ اسماء ذات باری کے ہے جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم سلام تمہارا حافظ ہو اور یا سلام سے تحیت مراد ہے سو اس صورت میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ تحیت کا واقع کرنا کسی تحیت کہنے والا کا کام نہیں بلکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے لبید صرف اسم تحیت کہنے کی قدرت رکھتے تھے لہذا قرآن مجید میں صاف وارد ہے وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسماء ذات باری نہیں ہو سکتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ذات باری ایک ہی ہے اور اسماء متعدد ہیں چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً مائۃ غیر واحد کیا کوئی اہل توحید اس امر کو جائز رکھے گا کہ ذات باری ننانوے ہیں معاذ اللہ یہ تو صریح کفر ہے۔ ہم نے اس بحث کو زیادہ طول نہیں دیا کیونکہ اس میں کوئی خاص مفید بات نظر نہیں آئی امام غزالیؒ اور امام رازیؒ نے اس بحث کو کسی قدر طول کے ساتھ لکھا ہے۔ فمن شاء فلیرجع الیہ

اسماء و صفات میں فرق

اسم کی تعریف نحوی ہمارے موجودہ بحث سے خارج ہے ہمیں یہاں

toobaa-elibrary.blogspot.com

اسم کے مفہوم عام سے بحث کرنا مد نظر ہے اس مفہوم کے رو سے اسم و فعل و حرف سب اسماء میں داخل ہیں کیونکہ اسم کا مفہوم عام صرف یہ ہے کہ وہ کسی حقیقت کا پتہ دیتا ہو خواہ وہ حقیقت مستقلہ ہو یا غیر مستقلہ اس صورت میں اگر وہ حقیقت صرف ایک چیز کے مفہوم تک محدود ہو تو وہ اسم ہے مثلاً سماء ارض جدار وغیرہ اور اگر اس کے ساتھ کسی وصف کا خیال بھی شامل ہو تو وہ صفت کہلائے گا مثلاً رازق خالق طویل وغیرہ بعض اہل علم نے اس امر پر بحث کی ہے کہ آیا اسم بہ نسبت صفت کے اشرف ہے یا بالعکس جو لوگ اسم کو اشرف مانتے ہیں وہ حسب ذیل دلیل پیش کرتے ہیں اسم بہ نسبت صفت کے مقدم ہے کیونکہ اسم کسی چیز کی ذات پر دلالت کرتا ہے اور صفت اس ذات کی ایک حالت کا نام ہے ظاہر ہے کہ خود چیز کسی چیز کی ذات اس کی کسی حالت پر مقدم ہوا کرتی ہے لہذا اسم تمام صیغہ ہائے صفت کے لئے ماخذ ہوتا ہے جس سے تمام صفات مشتق ہوتے ہیں اور ماخذ کا وجود مقدم ہوتا ہے اور صفت کا موخر یہ بالکل صحیح ہے کہ صیغہ صفت ذات کے علاوہ ایک وصف کا اظہار بھی کرتا ہے اور یہ بات اسم میں نہیں ہوتی اس صورت میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز سے کسی زیادہ علم کا افادہ ہو وہ اشرف ہے مگر حق یہ ہے کہ جب تک کسی چیز کی اصل ذات کا علم نہ ہو اس کے وصف کا علم بے معنے بات ہے لہذا اسم ہی کو اشرف ماننا زیادہ صحیح ہے۔

نفی و اثبات اسماء و صفات

عقائد اسلام میں یہ مسئلہ اہل کلام کے نزدیک نہایت معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اور مسئلہ جبر و قدر کی طرح لاینحل سمجھا گیا ہے ہم یہاں صرف مذہب حق اہل السنۃ والجماعت کا ذکر کر دیتے ہیں کیونکہ اختلاف و دلائل کی شرح و بسط کے لئے علم کلام کی کتابیں بھری پڑی ہیں جن کا نتیجہ بجز حیرت و دہشت کے کچھ بھی نہیں بات دراصل یہ ہے کہ بڑے بڑے علماء علم کلام کو دو متعارض

مقدمے مسئلہ صفات کی بابت مد نظر ہیں اور اس لئے وہ حیران ہیں کہ اس تعارض کو کیونکر دور کیا جائے وہ دو مقدمے یہ ہیں (مقدمہ اولے) وحدت کمال کا نام ہے اور کثرت نقصان کا اس مقدمے کے مان لینے پر اصحاب معقول کو یہ ضروری معلوم ہوا کہ ذات باری کی توحید پر پورا زور لگائیں چونکہ صفات متعددہ کے اثبات پر ذات باری کے متعلق کثرت کا خیال پیدا ہوتا ہے اس لئے انہوں نے مجبوراً صفات کی نفی کر دی (مقدمہ ثانیہ) چونکہ یہ مسلم ہے کہ ایک ایسی ذات جو علم قدرت' حکمت' ارادہ' کلام' سمع' بصر وغیرہ صفات میں کامل ہو بہ نسبت اس ذات کے جو ان صفات میں ناقص ہو یا ان صفات سے بالکل عاری ہو اکمل و اشرف سمجھی جاتی ہے اس لئے انہیں ضروری معلوم ہوا کہ ذات باری کے لئے ان صفات کو ثابت کریں اور چونکہ یہ صفات بجائے خود علیحدہ علیحدہ مختلف الماہیۃ ہیں اس لئے ذات باری کے متعلق کثرت کا ماننا بھی ضروری ہوا کچھ شک نہیں کہ بظاہر یہ ہر دو مقدمے متعارض ہیں اور اس تعارض کا دور کر دینا آسان نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر دو مسلک کے ماننے والوں کا مقصد اہم یہی ہے کہ ذات باری کو کامل اور ہر ایک عیب سے منزہ و مبرا مانا جاوے اکثر معتزلہ اور بعض دیگر فرقے مقدمہ اولے پر زور دیتے ہیں اور جمہور اہل علم فرقہ اہل سنت و الجماعۃ مقدمہ ثانیہ کو پیش کرتے ہیں اکثر حضرات متصوفہ کا مسلک بھی اس مسئلہ میں معتزلہ کا مسلک ہے اور وہ صفات کو عین ذات تسلیم کرتے ہیں یعنی وہ یہ مانتے ہیں کہ ایک ہی ذات بسیط تمام مختلف قسم کے آثار کا مصدر ہے غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس مسلک پر یہ اعتراض عائد ہوتا ہے کہ اس صورت میں قادریت اور عالمیت وغیرہ صفات سب ایک ہی حقیقت ہوں گی۔ اور ان میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں ہوگا۔ اور یہ صحیح نہیں کیونکہ حقیقت واحدہ دو حقیقتوں کا عین نہیں ہو سکتی لہذا ذات اور علم و قدرت وغیرہ ایک حقیقت نہیں اس کے جواب میں قائلین عینیت ذات و صفات کی طرف سے جواب مع دلائل دیئے گئے ہیں جو بتفصیل کتب کلام میں مذکور ہیں۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

جمہور اہل علم (جو صفات کو ذات سے علیحدہ مانتے ہیں۔) اس اعتراض کے جواب دہ ہیں کہ اگر صفات کو حادث مانیں تو ذات باری کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور اگر قدیم مانیں تو متعدد امور کو قدیم ماننا پڑے گا حالانکہ قدیم صرف ایک ہی ذات واجب الوجود ہو سکتی ہے نہ متعدد اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ذات باری کے صفات دو قسم کی ہیں (۱) صفات ثبوتیہ (۲) صفات سلبیہ پہلی قسم کے صفات ایک قسم کے اضافات ہیں یعنی محض ایک نسبت یا ربط ہیں جن سے ذات محضہ میں کسی قسم کا تعدد لازم نہیں آتا۔ اور صفات سلبیہ خود مفہوم سلب پر مشتمل ہیں اس لئے وہ بھی موجب تعدد نہیں ہو سکتے پس ہر دو صورت میں تعدد فی الذات لازم نہیں آتا لہذا صفات کا وجود ماننا ضروری ہے واضح ہو کہ ہر دو فریق کے اعتراضات و جوابات اور رد و قدح کا سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ اگر ہم اس کو بالاستیعاب لکھنے کی کوشش کریں تو ناظرین کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور خواہ مخواہ کتاب کا حجم بڑھانا ہو گا مع ھذا آج کل عام طبائع کو ایسے مباحث دقیقہ الفلسفیہ سے کوئی دلچسپی نہیں ذیل میں ہم اس عقیدہ کی جو اہل السنت و الجماعۃ کا ہے تشریح کر دیتے ہیں یہ مسلم ہے کہ ذات باری کی حقیقت اور کنہ کا ادراک ناممکن ہے اور وہ خود اپنی ذات کی نسبت لیس کمثلہ شیء ارشاد فرماتا ہے اس لئے انسان ضعیف البنیان جو کچھ صفات کی نسبت تصور کرے گا۔ وہ اس کی اپنی محدود عقل کا نتیجہ ہے مگر ذات باری اس سے بالاتر ہے۔

گفتا غلطی زانشاں نتواں داد
لاما تو ہر آنچہ دیدہ پایہ تست

ہر ایک شخص نے اپنی رائے پر اعتماد کر کے ایک نہ ایک مذہب قائم کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ ذات باری ہر ایک کے مجوزہ مذہب سے منزہ و مبرا ہے والعلم ما قیل۔

بر افگن پردہ تا معلوم گردد
کہ یاراں دیگرے رائے پر ستند

ہاں جن لوگوں نے کتاب و سنت کو اپنا قدوہ بنا لیا ہے اور ارباب معقول کے ڈھکوسلوں سے بیزار ہو چکے ہیں (مثلاً خاکسار مولف) وہ مسئلہ صفات میں بڑی احتیاط کرتے ہیں اور حضرات سلف کے مسلک سے سر مو تجاوز نہیں کرتے ان لوگوں کا اس بات پر ایمان ہے کہ جو کچھ کتاب اللہ اور سنت رسول میں آچکا ہے واجب التصدیق ہے اور بدوں اس کے کوئی طریق خالی از خطر نہیں ہو سکتا صفات ذات باری کی تصدیق ہمیں اس طرح کرنی چاہیے جس طرح قرآن و سنت میں وارد ہو چکی ہیں کیونکہ یہ مسلم ہے کہ جس طرح ذات مجہول الکنہ ہے اسی طرح اس کے صفات بھی مجہول الکنہ ہیں اس لئے طریق امن و عافیت یہی ہے کہ ہم ماجاء بہ الرسول پر ایمان لائیں اور رد و قدح کی طرف خیال تک نہ کریں کیونکہ جس قدر باطل فرقے پیدا ہوئے ہیں سب ذات باری اور اس کے صفات میں غور و خوض کرنے کا نتیجہ ہیں بڑے بڑے ائمہ دین نے بجز کتاب و سنت کی پیروی کرنے کے کوئی چارہ نہ دیکھا علامہ محمد بن عبد الکریم شہرستانی متوفی ۵۴۸ھ جو علم کلام کے ایک مشہور امام ہیں اور جن کی کتاب ملل و نحل شہرستانی علمائے علم کلام کے نزدیک بڑی معتبر سمجھی گئی ہے اپنے زمانے کے بے نظیر متکلم تھے چنانچہ کئی ایک دقیق مسائل علم کلام میں ان کے مباحث مشہور ہیں اخیر عمر میں عقلیات سے بیزار ہو کر متمسک بکتاب و سنت ہو گئے اور لوگوں کو بطور وصیت یوں کہا کرتے علیکم بدین العجائز فانہ من اسنی الجوائز یعنی بوڑھی عورتوں کا سا مضبوط دین اختیار کرو کیونکہ یہ گراں قیمت جائزہ ہے پھر لکھتے ہیں کہ جو کچھ قرآن و سنت میں وارد ہو چکا ہے اس پر بلا حجت سر تسلیم خم کر دو اور عقلیات کے پھندوں سے اپنے تئیں بچاؤ کیونکہ اس میدان میں داخل ہو کر امید نجات بہت کم ہے صحابہ اور تابعین کا یہی مسلک تھا اور تمام ائمہ نے اسی طرف رجوع کیا ہے اور میری تمہیں یہی وصیت ہے اگر تم لازم پکڑو گے تو بچ جاؤ گے ورنہ منکر کتاب و سنت ہو گے دلائل عقلیہ میں اس قدر تعارض موجود ہے کہ معتزلی اشعری کا اور اشعری معتزلی کا ابطال کر رہا ہے مگر انبیاء علیہم السلام

toobaa-elibrary.blogspot.com

کے طریق توحید میں کچھ اختلاف نہیں۔

رازی اور عقلیات سے توبہ

امام فخر الدین رازی نے عمر بھر عقلیات میں غلطاں و پیچاں رہ کر آخر کار طریق سلف صالحین کو اسلم و اصوب قرار دیا اور کہا کہ میں نے عقلیات میں دور دراز تک تحقیق کی اور ہر ایک مسئلہ کی پوری تدقیق کی مگر اطمینان قلب نصیب نہیں ہوا اور اثبات توحید میں جو طریق قرآن مجید نے اختیار کیا وہ نہایت مضبوط اور دل نشین ہے علم کلام پیاسے کی پیاس کو ہرگز نہیں بجھا سکتا ہاں لا الہ الا اللہ کی سادہ تعلیم کا مقابلہ کرنا محال ہے امام الحرمین عبدالملک جوینی استاد امام حجۃ الاسلام غزالیؒ جو علم کلام کے مشہور مصنف اور علمائے شافعیہ میں بڑی قدر و منزلت کے آدمی ہیں علم کلام سے منہ موڑ کر طریق سلف کی طرف متوجہ ہو گئے اور مرتے وقت کہنے لگے کہ تم لوگ گواہ رہنا کہ میں آج نیشا پور کی بوڑھیوں کے سے دین پر دنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ ولعم ما قیل

لقد طفت فی تلک المعاهد کلها وسیرت طرفی بین تلک المعالم
فلم ار الا واضعا کف حائر علی ذقن او قارعا سن نادم

میں نے منزل محبوب کے تمام کھنڈرات کی دیکھ بھال کی کہ کہیں ان کا پتہ مل جائے مگر کوئی پتہ نہ چلا اور جس کو وہاں دیکھا حیرت ندامت میں مستغرق پایا۔

ہم نے بطریق اختصار مسلک حق کو واضح کر دیا ہے امید ہے کہ ہر ایک اہل ایمان اسی مسلک کو لازم پکڑے گا کیونکہ صحت ایمان کا صحیح معیار یہی ہے معتقدات میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے کیونکہ آجکل نیچریت اور فلسفیت لوگوں کی طبائع پر غالب آرہی ہے اور صفات باری کو اپنے ناقص عقول کے معیار پر اندازہ کرنے لگ گئے ہیں اور یہ سخت خطرناک مرض ہے۔ معتقدات کے بارے میں سلف صالحین کے مسلک کے سوا سر مو ادھر ادھر نہیں ہونا چاہیے اور موجودہ زمانے کے محققین کو جو مغربی الحاد سے متاثر ہو چکے ہیں اور تاویلات

باطلہ سے ناواقفوں کو بہکاتے ہیں شیاطین الرجال سمجھ کر محترز رہنا چاہیے۔

اسماء ذات باری توقیفی ہیں یا قیاسی

علماء نے اس امر میں اختلاف کیا ہے کہ کیا ذات باری کے اسماء توقیفی ہیں یا قیاسی یعنی کیا ذات باری پر انہیں اسماء کا اطلاق کیا جا سکتا ہے جو کتاب و سنت میں وارد ہو چکے ہیں یا ان اسماء کا بھی جن کے معانی ذات باری کے حق میں قرار دینے جائز ہوں اور عقل ان معانی کے ثبوت پر دلالت کرتی ہو؟ جمہور علماء اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے کہ کسی اسم کا اطلاق ذات باری پر صرف سماع پر موقوف ہے ہم اپنی طرف سے کوئی اسم ذات باری کے لئے تجویز نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بعض اسماء اس کے شایان شان نہ ہوں مثلاً ہم ذات باری کو عارف عاقل لبیب وغیرہ نہیں کہہ سکتے وجہ اس کی یہ ہے کہ الفاظ معرفت عقل لب بسا اوقات ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو مدرک سے غائب ہونے کے بعد ادراک کئے جائیں اس مسئلہ میں مختلف مذاہب ہیں مگر ہمیں مسلک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نہایت معتدل معلوم ہوتا ہے لہذا طویل بحث سے اعراض کر کے انہیں کی تحقیق کا خلاصہ قلمبند کر دیتے ہیں امام رازیؒ نے بھی اسی تحقیق کو اختیار فرمایا ہے۔

امام صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں حق یہ ہے کہ اسماء کا اطلاق اذن شرع پر موقوف ہے اور صفات کا اطلاق بلا اذن جائز ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اس بات کا سمجھنا اسم و صفت میں امتیاز کرنے پر موقوف ہے اس لئے ہر دو میں پہلے مابہ الامتیاز کا قائم کرنا ضروری ہے سو واضح ہو کہ اسم ایک ایسا لفظ ہے جو کسی مسمی کی ذات پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہو مثلاً زید ایک شخص کی ذات پر دلالت کرتا ہے برخلاف اس کے صفت ایک ایسا لفظ ہے جو مسمی کے کسی وصف پر دلالت کرتا ہے مثلاً طویل یا ابیض ظاہر ہے کہ یا زید اور طویل یا ابیض کا مفہوم ایک نہیں کیونکہ یا زید سے صرف اسی شخص کی ذات

toobaa-elibrary.blogspot.com

مقصود ہے اور یا طویل یا ابیض سے ہمیں کبھی یہ گمان نہیں جاتا کہ طویل و ابیض اسی کے نام ہیں ہاں اگر صیغہ صفت کو کسی شخص کا علم قرار دیں تو پھر وصفی معنے ملحوظ نہیں ہوتے مثلاً قاسم گو صیغہ صفت ہے مگر جب کسی شخص کا نام ہو تو اس سے اس شخص کی ذات ہی مقصود ہو گی اسی طرح لفظ عبداللہ اگر کسی شخص کا نام ہو تو اس کے وصفی معنے مراد نہیں ہوں گے بلکہ اس شخص کی ذات مقصود ہو گی یہی وجہ ہے کہ لفظ عبداللہ کی جمع جبکہ علم ہو عبادلہ لکھا کرتے ہیں اور علم نہ ہونے کی صورت میں عباد اللہ کیونکہ علم ہونے کی صورت میں لفظ عبداللہ اسی طرح مفرد سمجھا گیا ہے جس طرح لفظ زید اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ کسی شخص کا اسم وہ لفظ ہوا کرتا ہے جس کو وہ خود یا اس کے والدین یا اس کے آقا اس کے لئے تجویز کیا کرتے ہیں اور اسی کو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص کو اس کا کوئی نیا نام تجویز کرنے کا حق نہیں۔

اسماء الرسولؐ

اسی طرح جناب پیغمبر علیہ السلام کے اسماء محدودہ ہیں جن کو خود آپ نے ارشاد فرما دیا اور وہ یہ ہیں احمد محمد المقفی' الماحی' العاقب' نبی التوبۃ' نبی الرحمۃ' نبی الملحمۃ ان اسماء شریفہ کے علاوہ ہم حضور علیہ السلام کے لئے کوئی نیا نام اپنی طرف سے تجویز نہیں کر سکتے سو جب ہم کسی شخص کے معین اسم کے علاوہ کوئی اور اسم اس کے لئے تجویز نہیں کر سکتے تو اللہ تعالیٰ کے لئے کیونکر کر سکتے ہیں ہاں بطور اظہار وصف ہم اس ذات مقدس پر الفاظ مرشد ہادی عالم رشید وغیرہ کا اطلاق کر سکتے ہیں مگر ایسے اسماء وصفیہ جن میں کسی قسم کے نقص کا مفہوم ہو ہم اطلاق نہیں کر سکتے مثلاً یا عدل یا صعر بول سکتے ہیں۔ کیونکہ صعر یا عدل میں یک گونہ نقص کا مفہوم پایا جاتا ہے اور جب ہر دو کو ملا کر بولیں تو اس سے مدح کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے حاصل یہ ہے کہ افعال و اوصاف کی نسبت کرتے وقت اجازت شریعت کی ضرورت نہیں مثلاً

موجود' موجد' مظہر' مخفی' مسعد' مشقی' مبقی وغیرہ صفات کا اطلاق صحیح ہے گو شریعت میں ان کا ورود نہیں ہوا مگر بطور اسم کے یہ اطلاق جائز نہیں۔

اسماء باری کے متعلق ابن تیمیہ کی تحقیق

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح کی جلد ثالث کے ایک مقام پر اطلاق لفظ جوہر کی تحقیق میں اس موضوع کے متعلق ایک مختصر سی تقریر کی ہے مناسب نظر آتا ہے کہ اس کا خلاصہ بھی درج کیا جائے وہ لکھتے ہیں کہ اسماء ذات باری کے متعلق اہل اسلام کے دو فریق ہیں ایک فریق کا خیال ہے کہ وہی اسماء ذات باری پر اطلاق کئے جا سکتے ہیں جو شریعت میں آچکے ہیں کیونکہ اسماء کا ذکر بغرض عبادت ہے اور عبادت کا مدار صرف سمع پر موقوف ہے جس میں تجویز عقل کو کچھ دخل نہیں دوسرے فریق کا خیال ہے کہ جس اسم کے معنی لغت کی رو سے صحیح ہوں اور ذات باری کے لئے وہ معنی ثابت ہوں تو ایسے اسم کا اطلاق اس پر جائز ہے کیونکہ شارع علیہ اسلام نے ہمیں ایسے اطلاق سے منع نہیں فرمایا۔

ان ہر دو مذہب کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ صحیح تیسرا مذہب ہے اور وہ یہ ہے کہ اطلاق اسم سے دو امر ملحوظ ہوتے ہیں بغرض عبادت ذکر میں زبان پر لانا یا اس ذات مقدس کی بابت کسی امر کی خبر دینا جب اسماء کو بغرض عبادت بولیں تو کچھ شک نہیں کہ صرف انہیں اسماء کا استعمال صحیح ہو گا جن کا شریعت میں ورود ہو چکا ہے قال اللہ تعالیٰ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ اور جب اس کی ذات کے متعلق کسی امر کی خبر دینا مقصود ہو تو اس صورت میں کسی ایسے اسم کا اطلاق صحیح ہے جو شریعت میں وارد نہیں ہوا۔ خواہ وہ عربی ہو یا فارسی ہو یا ہندی وغیرہ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس اسم سے ایسے معنی کا اظہار ہوتا ہو جو ذات باری کے لئے ثابت ہیں انتہائی غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ یہ مسلک وہی امام صاحب ہی کا مسلک ہے کوئی

toobaa-elibrary.blogspot.com

نئی بات نہیں۔

حدیث اسماء حسنیٰ کے متعلق چند مباحث

ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً من احصاھا دخل الجنۃ یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو شخص انہیں (بطور ذکر و دعا) شمار کرے گا جنت میں داخل ہوگا نیز ایک دوسری روایت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ میں یوں وارد ہوا ہے ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً مائۃ الا واحداً من احصاھا دخل الجنۃ انہ وتر یحب الوتر اس کے بعد اس روایت میں ننانوے اسماء کی تفصیل مذکور ہے اس حدیث میں چند سوال قابل غور ہیں۔

(۱) پہلی روایت میں جو بہ نسبت دوسری روایت کے قوی ہے اسماء کی تفصیل کیوں مذکور نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عدم تفصیل میں یہ مصلحت ہے کہ لوگوں کو جمیع اسماء و صفات پر مواظبت کرنے کا موقع ملے اور اس تفصیل کا اخفاء بعید ایسا ہے جیسے صلوٰۃ وسطیٰ اور لیلۃ القدر کا مخفی رکھنا کیونکہ تعیین سے لوگوں کو طلب اور شوق نہیں رہتا۔

(۲) عدد ننانوے کو مخصوص کر دینے سے یہ خیال گذرتا ہے کہ اسماء ذات باری صرف ننانوے ہیں اگر اس سے صرف اسماء بلا صفات مقصود ہیں تو سوال یہ ہے کہ یہ ننانوے تو بجز لفظ اللہ کے سب صفات ہیں پھر انہیں اسماء کہنے سے کیا مطلب؟ اور اگر یہ ننانوے صفات ہیں تو سوال یہ عائد ہوتا ہے کہ جب صفات لامتناہی ہیں تو ننانوے میں حصر کرنا کیسے صحیح ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ننانوے کی تخصیص سے یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا کہ اسماء ذات باری صرف ننانوے ہی ہیں بلکہ اس تخصیص کی دو وجہ ہو سکتی ہیں اول یہ ممکن ہے کہ یہ اسماء دیگر اسماء کی نسبت اعظم و اجل ہوں دوم جملہ ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً کو کلام تام نہ سمجھیں بلکہ مجموع کلام یعنی ان للہ تسعۃ وتسعین اسماً

من احصاھا دخل الجنۃ کو کلام تام سمجھیں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ایسے ہیں کہ جو شخص انہیں (بطور ذکر) تلاوت کرے وہ جنت میں داخل ہوگا اور اس کا وزن بعینہ یہ جملہ ہوگا ان للملک تسعۃ وتسعین مقاتلاً اعدھم للحرب یعنی بادشاہ کے پاس ننانوے ایسے بہادر ہیں جن کو اس نے لڑائی کے لئے تیار کر رکھا ہے اس جملہ سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ ننانوے بہادروں کے سوا اس کے پاس اور بہادر نہیں چنانچہ اس کی تائید میں ایک حدیث صحیح موجود ہے جو بروایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس شخص کو کوئی مشکل پیش آئے اور وہ یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور کر دیتا ہے دعا یہ ہے اللھم انی عبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک ماض فی حکمک عدل فی قضائک اسئلک بکل اسم ھولک سمیت بہ نفسک اوانزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع خاطری و نور صدری وجلاء حزنی وذھاب ھمی و غمی۔

اس دعاء ماثورہ میں جو ہر ایک مسلمان کو حفظ کر کے بطور ورد ہر روز پڑھنا چاہیے خصوصاً کسی مصیبت یا مشکل کے وقت الفاظ اواستاثرت بہ فی علم الغیب عندک سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ذات باری عز سمہ کے کچھ اسماء ایسے بھی ہیں جن کا علم صرف اسی ذات تک محدود ہے اور غیر کو ان پر اطلاع حاصل نہیں۔

(ج) کیا وجہ ہے کہ یہ اسماء پورے سو نہیں بلکہ ایک کم ہے؟

اس سوال کے جواب میں چند وجوہ کا احتمال ہو سکتا ہے اول تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کو مقدار عبادات کی تعیین میں جو حکمتیں مد نظر ہیں گو ہمیں ان کا علم نہ ہو مگر ہمیں بلا حجت تسلیم کر لینا چاہیے مثلاً مختلف نمازوں کی تعیین اوقات و رکعات وغیرہ کی حکمت کے متعلق ہم کوئی وجہ قطعی قرار نہیں دے سکتے اس کی کئی

toobaa-elibrary.blogspot.com

ایک مثالیں شریعت میں موجود ہیں مثلاً عشاء کی نماز میں دو رکعت سنت کا بعد از فریضہ قرار دینا اور فجر کی نماز میں قبل از فریضہ یا ملائکہ جہنم کا شمار انیس بتلانا یا ماہ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزوں کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر قرار دینا یا ذکر سبحان اللہ کا ثواب دس گنا اور الحمدللہ کا بیس گنا اور لا الہ الا اللہ کا تیس گنا اور اللہ اکبر کا چالیس گنا ہونا۔

(ان احکام کی گو شریعت میں تصریح نہیں ہوئی۔ مگر علماء نے وجوہ حکمت تجویز کئے ہیں۔ مثلاً عشاء کی نماز میں فریضہ کے بعد اور فجر میں فریضہ سے پہلے سنت کا قرار دینا اس حکمت پر مبنی ہے کہ رات کو دن بھر کی تکان اور ثقل غذا کی وجہ سے آناً فاناً نیند غلبہ کرتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے فریضہ ادا کر لیا جاوے تاکہ اگر کچھ خلل ہو تو سنت میں ہو نہ فریضہ میں اور فجر میں برعکس حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ نیند سے بیدار ہونے والا دیر تک ہوش و حواس نہیں سنبھالتا۔ اس لئے پہلے سنت ادا ہونی چاہئے۔ تاکہ اگر کچھ خلل ہو تو سنت میں ہو نہ فریضہ میں اسی طرح ملائکہ جہنم کا شمار انیس بتلانا۔ اس حکمت پر مبنی ہے کہ آٹھ پہر کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں پانچ نماز ہائے پنجگانہ میں محسوب ہوئے باقی انیس کی جواب دہی انسان کے ذمہ ہے جن میں کوئی نہ کوئی گناہ ہو ہی رہتا ہے کم از کم غفلت کا گناہ تو ضرور ہی عائد ہوتا ہے۔ بعض علماء نے اس انیس کی تعداد کے اور وجوہ بھی قرار دے ہیں ہم نے بوجہ طوالت انہیں قلمبند نہیں کیا اسی طرح شوال کے چھ روزوں کا ثواب سال بھر کے روزوں کے برابر محسوب ہونا اس حکمت پر مبنی ہے کہ تیس اور چھ مل کر چھتیس روزے ہوئے چونکہ ہر ایک نیکی کا ثواب دس گنا بارگاہ رب العزت سے دیا جاتا ہے اس لئے چھتیس کا دس گنا سال بھر کے برابر ہوا اسی طرح سبحان اللہ کا ذکر ایک دفعہ کرنے سے دس گنا ثواب ملتا ہے ظاہر ہے کہ جب الحمدللہ کہے گا تو بیس گنا ہو گا علی ہذا تیس گنا اور چالیس گنا)

وجہ دوم یہ ہے کہ ثانوے کی تخصیص کر دینے میں اس امر کی طرف

اشارہ ہے کہ ذات باری کے اسماء قیاسی نہیں بلکہ صرف سمعی ہیں جو اجازت شریعت پر موقوف ہیں اس وجہ کو محمد بن عبدالملک طبری نے لکھا ہے اور امام رازی نے اسے پسند کیا ہے۔

وجہ سوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر (طاق) شفع (جفت) کی نسبت اشرف ہے۔ کیونکہ وتر میں فردانیت پائی جاتی ہے جو وحدت کا نتیجہ ہے اور وحدت صفت ذات باری ہے مع ھذا وتر شفع کا محتاج نہیں اور شفع وتر کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا نیز شفع کا نصف ضروری ہے کہ عدد صحیح ہو۔

اور وتر صحیح عدد میں تنصیف قبول نہیں کرتا اور قبول قسمت ضعف پر دلالت کرتا ہے اور عدم قبول قوت پر مگر وتر کے افضل و اشرف ہونے میں صحیح توجیہ یہ ہے کہ واحد تمام اعداد کا منبع ہے اگر واحد نہ ہو تو دو تین چار پانچ وغیرہ کا کوئی وجود نہیں اور ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وتریت تمام مراتب اعداد میں موجود ہے اور شفعیت میں یہ وصف نہیں لہذا وتر شفع پر غالب ہے ان اللہ وتر یحب الوتر (د) روایت ثانیہ میں تسعة و تسعین مائة الا واحداً واقع ہوا ہے اور اس میں تکرار سے جو بظاہر منافی بلاغت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ تکرار مبنی علی تاکید ہے جیسے ثلاثة فی الحج و سبعة اذا رجعتم کے بعد فرمایا تلک عشرة کاملة اور ایک دوسری روایت میں لاتتخذوا الھین اثنین فرمایا جا تکہ الھین سے دو کا مفہوم صاف واضح تھا مگر اثنین بطور تاکید زیادہ کیا گیا اور تاکید معنی عند الضرورت بلاغت ہے مع ھذا تسعة و تسعین کی جگہ اگر کبھی کاتب غلطی سے سبعة وسبعین لکھ دے تو جملہ مائة الا واحداً اس تصحیف کی تصحیح کر سکتا ہے۔

(د) اس حدیث میں محدثین نے بحث کی ہے امام احمد اور بیہقی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور ترمذی بھی اس کے ضعف کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس ضعف کے متعلق چند وجوہ بیان کئے گئے ہیں۔

اول یہ کہ تحقیق میں تفصیل اسماء مذکور نہیں ہوئی دوم ابوہریرہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

رضی اللہ عنہ سے دو روایتیں مسطورہ بالا مروی ہیں اور ہر دو میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے سوم اسماء مذکورہ فی الحدیث میں اسم رب کا ذکر نہیں آیا۔ حالانکہ قرآن مجید میں مذکور ہے اور ایسے ہی اسم حنان و اسم منان کا ذکر نہیں آیا حالانکہ اخبار صحیحہ میں یہ ہر دو اسم مذکور ہیں چہارم روایت مذکورہ بالا میں اسماء جس ترتیب سے مذکور ہیں وہ ترتیب احسن نہیں سمجھی گئی کیونکہ ترتیب احسن یہ ہے کہ پہلے اسماء ذات مذکور ہوں پھر اسماء حیات پھر اسماء علم و قدرت وغیرہ پھر دیگر اسماء صفات مثلاً خالق و رازق و مبدی و معید وغیرہ مگر روایت مذکورہ میں یہ ترتیب ملحوظ نہیں بلکہ اس کے برعکس اسماء صفات کا ذکر ہوا ہے چنانچہ پہلے محی و ممیت کا ذکر کر کے بعد ازاں اسم حی کا مذکور ہوا ہے حالانکہ ترتیب احسن کی رو سے اسم حی پہلے مذکور ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ کہا جائے کہ بعض اسماء دیگر بعض کی نسبت اشرف و اعظم ہیں تو اس لحاظ سے بھی روایت مذکورہ بالا میں ترتیب احسن کو ملحوظ نہیں رکھا گیا البتہ پہلے دو اسموں یعنی اللہ اور رحمٰن میں تو اس ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے مگر بعد کے اسماء میں یہ ترتیب قائم نہیں رہ سکی ان وجوہ ضعف کا جواب علماء نے صرف یہ دیا ہے کہ روایت ثانیہ جو تفصیل اسماء پر مشتمل ہے چنداں قوی نہیں مگر چونکہ اکثر اسماء و صفات مفصلہ فی الحدیث کا ذکر قرآن و احادیث میں آچکا ہے اور عقل بھی ان کے مدلولات کو مجملہ کمالات ذات باری کے تسلیم کرتی ہے لہٰذا اس کے قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں رہا۔ حسن ترتیب کا سوال سو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ترتیب مذکورہ فی الحدیث میں ممکن ہے کہ کچھ ایسے حکم و مصالح ملحوظ ہوں جن کا ہمیں علم نہیں لہٰذا وہ واجب التسلیم و التصدیق ہیں۔

(د) حدیث مذکورہ بالا میں لفظ احصاھا واقع ہوا ہے اس کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے؟

اس سوال کے متعلق علماء نے مختلف توجیہات بیان کی ہیں اول یہ کہ احصاء بمعنے شمار کرنے کے ہے مطلب یہ ہو گا کہ جو شخص اسماء مذکورہ بالا کو

دعاء میں بطور ذکر پورا شمار کرے تو وہ داخل جنت ہو گا مگر اس توجیہ پر بعض علماء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کو بذل نفس اور بذل مال کے ساتھ مشروط کیا ہے پھر صرف ان اسماء کے تلاوت کرنے سے جنت کا استحقاق کیسے ہو سکتا ہے قال اللہ تعالیٰ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمانداروں سے ان کے نفسوں اور مالوں کو جنت کے عوض خرید لیا ہے دوم یہ کہ لفظ احصاء بمعنی شمار سے صرف شمار زبانی مراد نہیں بلکہ ایسا شمار جو مقرون بالعقل ہو اس طرح کہ بندہ اپنے رب کو اس کے صفات کاملہ کے ساتھ یاد کرے اور تمام اشیاء موجودات کو اس کے صفات کاملہ کا مظہر جانے سوم احصاء بمعنی اطاقۃ کے بھی مستعمل ہے علم ان لن تحصوہ ای لن تطیقوہ اور ایک حدیث میں وارد ہوا ہے استقیموا ولن تحصوا ای لن تطیقوا کل الاستقامۃ یعنی تم پوری استقامت نہیں کر سکو گے اس توجیہ کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جو شخص ان اسماء اللہ کی رعایت حرمت کی کامل قدرت رکھتا ہو وہ داخل جنت ہو گا اور رعایت حرمت سے مراد حقیقت احسان کو جا لینا ہے جس کو حدیث جبرئیل میں بدیں الفاظ بیان فرمایا ہے۔ ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک یعنی احسان کی حقیقت یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر ادا کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ رتبہ حاصل نہ ہو سکے تو اتنا ہی سہی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے اس توجیہ اور توجیہ ثانی میں یہ امتیاز ہے کہ ثانی سے صرف علم صفات مراد ہے اور ثالث سے پورا حق عبودیت ادا کرنا چہارم یہ کہ روایت مرویہ صحیحین کی توجیہ جو تفصیل اسماء سے جاری ہے یوں ہو سکتی ہے کہ لفظ احصاء کو معنے طلب پر محمول کیا جائے یعنی جو شخص قرآن و احادیث صحیحہ میں ننانوے اسماء کی تلاش و تفحص کرے وہ داخل جنت ہو گا ظاہر ہے کہ اس طور پر ننانوے اسماء کا انتخاب کرنا علم اصول و فروع میں پوری مہارت رکھنے پر موقوف ہے اور جو شخص اس درجہ تک علوم دینیہ کا مجتہد ہو گا۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مستحق جنت ہوگا۔ وَ ذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ

فضیلت ذکر اسماء حسنیٰ

اس موضوع کے اثبات میں قرآن و حدیث اور دلائل عقلیہ موجود ہیں قرآن مجید میں اس کے متعلق چار آیات وارد ہوئی ہیں۔

(۱) وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (اعراف)

(۲) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل)

(۳) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (طٰہٰ)

(٤) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (حشر)

لفظ حسنیٰ بروزن فعلیٰ صیغہ مونث افعل التفضیل کا ہے جس کا صیغہ مذکر احسن ہے جیسے عظمیٰ اور کبریٰ کہ یہ ہر دو صیغہ مونث ہیں جن کے صیغہ مذکر عظم و اکبر ہیں ان اسماء کو حسنیٰ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اسماء صفات کمالیہ ذات باری پر دلالت کرتے ہیں یا یوں کہو کہ معانی حسنہ مثلاً وحدانیت جلال عزت احسان وغیرہ پر مشتمل ہیں اور آیۃ سورۃ اعراف میں الحاد فی الاسماء کا ذکر ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسماء ذات باری کے متعلق عقائد کا صحیح علم حاصل کرنا عین ایمان ہے الحاد امر حق سے میلان کر جانے کو بولتے ہیں اور اسماء ذات باری میں الحاد یہ ہے کہ ایسے امور کی نسبت اس ذات مقدس کی طرف کی جائے جس سے وہ بری ہے جیسے عیسائی اس کو جوہر اور مسیح علیہ السلام کا باپ کہتے ہیں یا بعض اسلامی فرقے اس کو ایک جسم مانتے ہیں ان لوگوں کو مجسمہ کہتے ہیں اور الحاد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن صفات کاملہ کی وہ ذات مستحق ہے ان کی نفی کر دی جائے جیسے معتزلہ جنہوں نے ذات باری کے صفات کا انکار کر دیا حالانکہ نصوص قرآنیہ صاف طور پر صفات کو ثابت

کرتی ہیں۔

فضیلت ذکر میں بہت سی آیات وارد ہیں منجملہ ان کے ایک یہ آیت ہے فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ اس آیت میں ہمیں دو امر کی ہدایت کی گئی ہے اول ذکر دوم شکر مگر ذکر کو مقدم رکھا ہے کیونکہ ذکر محض اس ذات مقدسہ کے ساتھ مشتغل ہونے کو کہتے ہیں اور شکر میں غیر اللہ یعنی نعمت منعم کا خیال بھی ہوتا ہے ذکر کی بالعموم تین صورتیں ہیں ذکر باللسان ذکر بالقلب ذکر بالجوارح (دست و پا) ذکر باللسان سے وہ الفاظ مراد ہیں جو ذات باری عزاسمہ کی تحمید و تمجید و تسبیح پر دلالت کرتے ہیں اور ذکر بالقلب کے تین اقسام ہیں اول دلائل ذات و صفات میں تفکر کرنا دوم تکالیف شرعیہ یعنی احکام کے دلائل میں تفکر کرنا جس سے احکام کی حکمتیں اور ان کے اسرار منکشف ہوتے ہیں سوم مخلوقات ذات باری کے اسرار میں تفکر کرنا جس سے تفکر کرنے والے کو تمام ذرات کائنات عالم غیب کا صحیح نقشہ بن کر نظر آئیں ذکر بالجوارح کی یہ صورت ہے کہ تمام اعضاء بیرونی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مقصور ہو کر ممنوعات سے محفوظ ہو جائیں چنانچہ انہیں معنی میں اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ کو لفظ ذکر سے تعبیر کیا ہے۔

مذکورہ بالا ہر سہ اقسام ذکر میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ آیت اذکرونی میں ہر سہ طریق ذکر داخل ہیں اور اذکرکم کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر سہ غایات کرامات و خیرات مضمر ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کو ذکر کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں غایت شریعت اور غایت طریقت اور غایت حقیقت کے انعامات سے بہرہ یاب کرتا ہے گویا ہر سہ اقسام ذکر کے مقابل میں ہر سہ اقسام خیرات کے عطا کئے جاتے ہیں اور آیت وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا میں بھی انہیں ہر سہ مراتب خیرات کی طرف بالفاظ عفو مغفرت رحمت اشارہ کیا گیا ہے اور سورۃ واقعہ کے اخیر میں جو الفاظ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ وارد ہوئے ہیں یہیں ہر سہ مراتب خیرات کی طرف

toobaa-elibrary.blogspot.com

اشارہ کرتے ہیں آیت اُذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ کی تفسیر میں مختلف اقوال بیان کئے گئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(ا) اذکرونی بالنعمة اذکر کم بالرحمة ترجمہ۔ یعنی تم میری نعمت کے ساتھ مجھے یاد کرو میں اپنی رحمت نازل کر کے تمہیں یاد کروں گا۔

(ب) اذکرونی بالدعاء اذکر کم باعطاء النعماء یعنی تم مجھے دنیا میں پکارو میں تمہیں اپنی نعمت عطا کروں گا۔

(ج) اذکرونی فی الدنیا اذکر کم فی العقبی یعنی تم مجھے دنیا میں یاد رکھو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔

(د) اذکرونی فی الخلوات اذکر کم فی العلوات یعنی تم مجھے خلوتوں میں یاد کرو میں تمہیں جنگلوں میں یاد کروں گا۔

(ہ) اذکرونی فی الرخاء اذکر کم فی وقت الرجاء یعنی تم مجھے فراغت اور فراخی کے وقت یاد کرو میں تمہیں ضرورت کے وقت یاد کرونگا۔

(و) اذکرونی بطاعتی اذکر کم بمعونتی یعنی تم مجھے طاعت کے ساتھ یاد کرو میں اپنی اعانت سے تمہیں یاد کروں گا۔

(ز) اذکرونی بالصدق والا خلاص اذکر کم بالخلاص و مزید الاختصاص یعنی تم مجھے صدق اور اخلاص سے یاد کرو میں تمہیں نجات دیکر اور زیادہ خصوصیت عطا فرما کر یاد کروں گا۔

(ح) اذکرونی بالربوبیة فی الفاتحة اذکر کم بالرحمة والمعونة فی الخاتمة یعنی تم آغاز میں مجھے ربوبیت کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں اخیر پر اپنی رحمت اور مدد کے ساتھ یاد کروں گا۔

(ط) اذکرونی بالخوف والرجاء اذکر کم بالا من والا عطا یعنی تم مجھے خوف اور رجا کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں امن و عطا کے ساتھ یاد کروں گا۔

(ی) اذکرونی بالشکر اذکرکم بالزیادة یعنی تم مجھے شکر کے ساتھ یاد کرو میں تمہیں زیادتی نعمت کے ساتھ یاد کرونگا۔

اور مجملہ آیات ذکر کے ایک یہ آیت ہے وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّاللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا اس آیت کے ماقبل میں مختلف افعال خیر کے عاملین کا ذکر ہے اور اس کو عمل ذکر کرنے والوں پر ختم کیا ہے اور مجملہ آیات ذکر کے ایک یہ آیت بھی ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا اس آیت میں بھی ذکر کثیر کی تلقین فرمائی ہے اور ذکر کثیر کی فضیلت احادیث میں بھرتے تمام موجود ہے عبداللہ بن بشیر مازنی سے روایت ہے کہ ایک اعرابی جناب پیغمبر علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور پوچھا یارسول اللہ افضل الناس کون شخص ہے ؟ آپ نے فرمایا اس شخص کے لئے خوشخبری ہو جس کو عمر لمبی ملی اور اعمال صالحہ جو لایا اس نے عرض کیا یارسول اللہ کونسا عمل افضل ہے آپ نے فرمایا ان تفارق الدنیا ولسانک رطب بذکر اللہ یعنی تیرا دنیا کو اس حالت میں چھوڑنا کہ تیری زبان ذکر اللہ سے تر ہو یعنی تو ذکر کرتے کرتے جان دیدے کیفیت ذکر کو اللہ تعالیٰ نے بالفاظ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ خود بیان فرمایا ہے اس آیت میں انسانی زندگی کے ہر سہ حالات میں ذکر کی ضرورت کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ انسان ہر سہ حالات میں سے کسی ایک نہ ایک حالت میں ضرور ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ لیل و نہار بروبحر' سفر و حضر غناو فقر صحت و مرض میں ذکر کو مت چھوڑو اب چوتھی کوئی صورت متصور نہیں بعض محققین نے اس آیت کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم بطور فرض کے انسان پر عائد نہیں کیا جس کے لئے ایک حد معین نہ کی ہو اور اس کے متعلق بعض حالات میں انسان کو معذور نہ رکھا ہو مگر ذکر کے متعلق نہ تو کوئی حد مقرر کی ہے نہ کسی حالت میں کسی کو معذور قرار دیا ہے الا مجنون اور فاتر العقل پھر فرمایا اُذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا یعنی اللہ تعالیٰ کو ایسے یاد کرو جیسے تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو۔ یا اس سے بھی زیادہ علماء نے اس تشبیہ میں چند ایک توجیہات کا ذکر کیا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

(ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں تمہاری کوتاہی عمل سے آگاہ ہوں اگر تم اپنی اولاد کی طرح مجھے یاد نہیں کر سکتے تو اپنے آباء کی طرح ہی یاد کرو۔

(ب) انسان کا قاعدہ ہے باپ کی یاد تعظیم کیساتھ کرتا ہے اور بیٹے کی یاد شفقت کے ساتھ اور جناب باری کے شایان شان تعظیم ہے نہ شفقت۔

(ج) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان تیرے ظاہری وجود کا جب تو تیرا باپ ہے اور حقیقی سبب میں ہوں سو تم مجھے ایسے یاد کرو جیسے باپ کو اور میں تمہیں ایسا پیار کرتا ہوں جیسے باپ اپنے بیٹے سے گو میری ذات باپ اور بیٹے کی نسبت سے بری ہے۔

(د) بیٹا صرف اپنے باپ کی طرف منسوب ہو سکتا ہے اور اس ایک ہی نسبت پر اس کا فخر ہوتا ہے اور اگر کسی غیر کی طرف منسوب ہو تو اس نسبت سے وہ عار کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صرف میری ہی معبودیت تک محدود رہو کسی غیر کی طرف ہونے سے حیاء کرو کیونکہ یہ شرک ہے جو ظلم عظیم ہے۔

(ہ) انسان مصیبت کے وقت اپنے باپ سے زیادہ کسی کو اپنا شفیق نہیں سمجھتا اور اسی سے امداد طلب کرتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے ایسا یاد کرو جیسے تم مصیبت کے وقت اپنے باپ کو یاد کیا کرتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کسی شخص کے باپ کو برائی سے یاد کرنا انسان کے لئے موجب غضب ہوا کرتا ہے اسی طرح جب تیری ذات مقدس کو کوئی برائی سے یاد کرے تمہیں غیرت سے کام لینا چاہیے۔

(ز) سب سے پہلے جو جب بولنا سیکھتا ہے تو ب یا با اس کے منہ سے نکلتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اسی طرح ہر ایک کام کے شروع میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔

(ح) انسان ہمیشہ اپنے آباء و اجداد کا ذکر خیر کیا کرتا ہے اسی طرح ضروری

ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی تسبیح و تحمید کو جاری رکھے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکمت ذکر کو بھی قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے جس کی دو صورتیں ہیں ایک تو آیۃ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ میں مذکور ہے اس آیت کی توجیہ دو طرح ہو سکتی ہے اول تو یہ کہ ماسوا ذات باری کے تمام مخلوقات ممکن لذاتہ ہے اور جو چیز ممکن لذاتہ ہے وہ محتاج الی الغیر ہے اس لئے سوا ذات باری کے کوئی چیز اس قابل نہیں کہ موجب اطمینان ہو سکے کیونکہ جو چیز خود محتاج ہے وہ کبھی مقطع حاجت نہیں ہو سکتی چونکہ ذات باری واجب بذاتہ ہی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر ایک قسم کی حاجت کا مقطع قرار پا سکے لہذا اس کا ذکر موجب اطمینان قلب ہے دوم یہ کہ انسان کی حاجت غیر متناہی ہیں اور مخلوقات متناہی ہے اور متناہی کو غیر متناہی سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم انسان کی حاجت کو پورا کر سکتا ہے اور اسی لئے وہ موجب اطمینان قلب ہے۔

حکمت دوم آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ میں بیان کی گئی ہے اس آیت میں متقین کی اس حالت کا بیان ہوا ہے جو کسی وسوسہ شیطانیہ کے پیدا ہونے پر ہوتی ہے یعنی جب شیطان قلب مومن پر کسی قسم کی ظلمت ڈالتا ہے تو وہ لوگ جھٹ ذکر اللہ کی طرف رجوع کر کے صراط مستقیم پر آجاتے ہیں اور اس طرح شیطان کے تصرف سے محفوظ رہتے ہیں کیونکہ ذکر اللہ موجب ورود انوار ہے جس سے تمام اخری ظلمات دور ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جہاں قرآن مجید میں منافع کا ذکر بیان کیا گیا ہے ذکر سے اعراض کرنے کے مفاسد کا ذکر بھی وارد ہوا ہے ان مفاسد کی چار صورتیں ہیں۔

(ا) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَ

toobaa-elibrary.blogspot.com

قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر فرمایا ہے کہ جو شخص اس کے ذکر سے اعراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو مرنے کے بعد ایک بری زندگی اور تنگی عیش میں مبتلا کرتا ہے اور قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا اور جمال خداوندی کے دیدار سے محروم رہے گا۔

(ب) وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ
اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص ذکر اللہ سے منہ پھیر لیتا ہے اللہ تعالیٰ ایک شیطان کو اس کا ساتھی بنا دیتا ہے جو ہر وقت اس شخص پر متصرف رہتا ہے اور جس طرف چاہتا ہے اس کو لے جاتا ہے۔

(ج) وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا اس آیت میں بھی ذکر سے اعراض کرنے پر وعید عذاب سنائی گئی ہے اور عذاب اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص نہ تو دنیا میں حیوۃ طیبہ کا مالک ہو سکتا ہے نہ آخرت میں انعام رحمت کا مستحق اور یہی ایک بھاری عذاب ہے۔

(د) لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص دنیوی تعلقات میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے وہ زیانکار ہوتا ہے۔

فضیلت ذکر کی نسبت یہی کافی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مقام عبودیت میں ملائکہ کے علو درجہ کو ظاہر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْئَمُوْنَ یعنی رات دن اس کی تسبیح پکارتے ہیں اور اکتاتے نہیں پھر فرمایا يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ یعنی اللہ تعالیٰ کی تسبیح حمد کے ساتھ پکارتے ہیں اور افراد انسانی کے حق میں فرمایا رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ یعنی مساجد میں ایسے بھی مردان خدا ہیں۔ جنہیں خرید و فروخت وغیرہ معاملات اللہ تعالیٰ کے ذکر سے باز نہیں

رکھتے۔

فضیلت ذکر احادیث میں بصریح تمام مذکور ہے بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا انا عندظن عبدی بی وانا معه اذاذکرنی فی نفسه ذکرته فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرته فی ملاء خیر منهم وان تقرب منی شبراً تقربت منه ذراعاوان تقرب منی ذراعا تقربت منه باعا وان اتانی یمشی اتیته هرولة یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندہ کے ساتھ ویسا ہی ہوں جیسا وہ میرے حق میں گمان رکھتا ہے اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے جماعت میں ذکر کرتا ہے تو میں اس جماعت سے بہتر جماعت (ملائکہ) میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت بھر قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ بھر اس سے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں بڑی جلدی سے قدم اٹھا کر اس کی طرف پہنچتا ہوں۔

اور ایک دوسری حدیث میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔ اذا ذکرالعبدربه کتب الله له ذالك فی صحیفته ثم یعارض الملائکة یوم الخمیس فیریهم الله ذکر عبده له بقلبه فتقول الملائکة ربنا کل عمل هذا العبد احصیناه اما هذافلا نعرفه فیقول الله تعالی ان عبدی ذکرنی بقلبه مائبته فی صحیفته ذالك قوله تعالی اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

یعنی جس وقت بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس شخص کے نامہ اعمال میں لکھ لیتا ہے پھر پنجشنبہ کے دن گروہ ملائکہ کے سامنے اس کے نامہ کو مقابلۃً پیش کر کے اپنے بندہ کے ذکر کو جو اس نے اپنے دل میں کیا ہوتا ہے دکھاتا ہے تب ملائکہ کہتے ہیں کہ خدایا اس بندے کے تمام اعمال کو ہم نے ضبط کر رکھا ہے مگر اس کے فلاں عمل کو جو اس نامہ میں لکھا ہے ہم

toobaa-elibrary.blogspot.com

نہیں جانتے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا تھا میں نے اس کو اس کے نامہ اعمال میں درج کر دیا اللہ تعالیٰ کے قول اِنَّا کُنَّا نَسْتَنْسِخُ کے یہی معنی ہیں۔

پھر فرمایا ذکر اللہ علم الایمان و حصن من الشیطن و براءۃ من النفاق و حرز من النار یعنی اللہ تعالیٰ کا ذکر ایمان کی علامت اور شیطان سے بچنے کے لئے قلعہ اور نفاق سے بریت اور دوزخ سے پناہ ہے۔

پھر فرمایا مامن عبد یقع جنبہ علی الفراش ویذکر اللہ الا کتب ذاکرا الی ان یستیقظ یعنی بندہ جب سوتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کر کے سوتا ہے تو بیدار ہونے تک وہ ذاکر ہی لکھا جاتا ہے اور بروایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا رب و ددت ان اعلم من تحب من عبادک فاحبہ فقال اذا رایت عبدی یکثر ذکری فانا احبہ و اذا رایت عبدی لا یذکرنی فانا ابغضہ یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ خدایا میں چاہتا ہوں کہ تیرے اس بندے کو جانوں جس کو تو اپنے بندوں میں سے دوست رکھتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تو کسی بندے کو دیکھے کہ میرا ذکر بہت کرتا ہے تو جان لے کہ میں اس کو دوست رکھتا ہوں اور جب تو کسی بندے کو دیکھے کہ وہ میرا ذکر نہیں کرتا تو جان لے کہ میں اسے دشمن رکھتا ہوں۔

اور بروایت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبق المفردون قیل ومن المفردون قال المستہترون بذکر اللہ یضع الذکر عنہم اثقالہم فیاتون یوم القیامۃ خفافا یعنی مفردون سبقت لے گئے صحابہ نے پوچھا مفردون کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ وہ لوگ جو ذکر اللہ میں مشہور ہو گئے ہیں ایسے لوگوں سے ذکر تمام بوجھوں کو اتار دیتا ہے اور قیامت کو سبکدوش ہو کر خدا تعالیٰ کے سامنے آئیں گے اور بروایت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے الا انبئکم بخیر

اعمالکم وازکاھا وارضاھا عند ملیککم وارفعھا فی درجاتکم قالوا بلی وما ذاک یا نبی اللہ قال ذکر اللہ یعنی حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسے عمل پر آگاہ نہ کروں جو تمام اعمال سے بہتر اور سب سے پاکیزہ اور سب سے بڑھ کر خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث اور سب سے بڑھ کر مدارج کو بلند کرنے والا ہو صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ فرمایئے وہ کونسا عمل ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

اور بروایت عبد اللہ بن بسر مازنی مروی ہے جاء اعرابی الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال ای الناس خیر فقال طوبی لمن طال عمرہ و حسن عملہ فقال یا رسول اللہ ای الاعمال افضل فقال ان تفارق الدنیا ولسانک رطب من ذکر اللہ یعنی ایک اعرابی خدمت اقدس نبویؐ میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ کونسا عمل بہتر ہے آپ نے فرمایا خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جس کی عمر لمبی ہو اور وہ اعمال صالحہ جمع کرتا ہو اعرابی نے پوچھا یا رسول اللہ کونسا عمل افضل ہے آپ نے فرمایا کہ تو دنیا کو ایسی حالت میں چھوڑے کہ ذکر اللہ سے تیری زبان تر ہو۔

فضیلت ذکر میں اس حدیث کو غور سے پڑھو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کلمتان خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان یعنی دو کلمے ایسے ہیں کہ جن کا زبان پر جاری ہونا تو بالکل آسان ہے مگر قیامت کو میزان حسنات میں ان کا بڑا بوجھ ہو گا وہ کلمات یہ ہیں سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم

اور بھی بہت سی احادیث فضیلت ذکر میں وارد ہیں مگر بقدر کفایت ہم نے چند ایک کا ذکر کر دیا ہے۔

حقیقۃ الدعاء

جس طرح اللہ تعالیٰ نے مادی اسباب کا سلسلہ قائم کیا ہے اسی طرح

toobaa-elibrary.blogspot.com

روحانی سلسلہ اسباب کو بعض امور کے ساتھ تعلق دیا ہے جن کے وجود اور ضرورت سے کسی صورت میں انکار نہیں ہو سکتا منجملہ ایسے اسباب کے دعاء بھی ایک سبب ہے جس کو اکثر حالات میں کسی امر کے اسباب مناسبہ کے مہیا کرنے میں پورا دخل ہے بلکہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ خالص دعاء کے ذریعہ سے اسباب ضروریہ ایسے طور پر مہیا ہو جایا کرتے ہیں کہ عاجز بندہ کے خیال میں ان کا ان حالات میں پیدا ہونا بالکل غیر متوقع تھا چونکہ فطرت انسانی کو اپنے خالق سے ایک ایسا مخفی تعلق ہے جس کی حقیقت سے عوام الناس آگاہ نہیں ہو سکتے اور اسی تعلق کے مقتضاء پر دعاء کا اثر ظاہر ہوتا ہے اس لئے غایت جہالت کی وجہ سے دعاء کی ضرورت اور تاثیر کا انکار کرنے لگ گئے مگر اس انکار میں مبتلا ہونے والے اکثر وہ جہال فلاسفہ ہیں جو ملحدین نیاچرہ کہلاتے ہیں ہم ذیل میں اس مفسدہ گروہ کے خیالات کو باطل ثابت کرتے ہیں جب ہم از روئے کتاب و سنت اس امر پر ایمان رکھتے ہیں کہ ہمارا ایک ایسا خالق ہے جو تمام صفات کاملہ سے موصوف ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے آزاد ارادہ سے کرتا ہے اور وہ فعل عین مصلحت ہوتا ہے اس لئے ہماری آسانی کے لئے ہماری ضرورتوں کے موافق سلسلہ اسباب قائم کر کے ہم کو اس کی طرف ہدایت کی ہے چونکہ وہ سمیع و بصیر ہے اس لئے وہ ہر ایک کی پکار کو سنتا اور اس کے حالات کو دیکھتا ہے یہ امر ہماری فطرت کا اقتضاء ہے کہ ہم اپنی ضرورتوں پر اسباب مناسبہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی امر کے لئے اسباب نہیں اور ہم عاجز آجاتے ہیں تو مجبوراً اپنے خالق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں چونکہ وہ ہماری حالت کو دیکھتا ہے اور اس کو ہماری ضرورت کا علم ہے اور وہ ہماری پکار کو سنتا ہے اور رحمت کا نازل کرنا اس کی ذاتی وصف ہے لہذا جب ہم خارجی اسباب سے قطع تعلق کر کے اس کو موثر حقیقی یقین کرتے ہیں اور تمام سلسلہ اسباب کو اس کی مشیت کا مقہور و مغلوب جانتے ہیں۔ تو اس کی ارادت ہماری ضرورت کے مطابق حرکت کر کے ملائکہ رحمت کو اسباب مناسبہ کی فراہمی کا حکم دیتی ہے ہم ان اسباب کی طرف

رجوع کر کے فائز بالمرام ہوتے ہیں۔

حقیقت استجابت دعا

اور یہی استجابت دعاء کی حقیقت ہے مگر حق یہ ہے کہ جب مرکز عبودیت پر آدمی اپنے پاؤں جما لیتا ہے اور اس کو اپنے ضعف و عجز کا کامل یقین ہو جاتا ہے اور ظاہر و باطن میں منکسر ہو کر حضرت رب العزت کی بارگاہ میں جھک پڑتا ہے۔ تو ایسی حالت میں رحمت الٰہی جوش میں آکر بندہ کو انواع و اقسام کے انعامات و کرامات کا مورد بنا دیتی ہے اور اس عجز و احتیاج کی اس بارگاہ ذوالجلال میں وہ قدر و قیمت ہے کہ ساٹھ سال کی عبادت ایک وقت کی اس کیفیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر جن شورہ پشتوں کا مذاق استدلال فلسفی نے بگاڑ دیا ہے اور بجز مادہ پرستی کے کسی حقیقت کا انہیں علم نہیں وہ نہ تو اس کیفیت کی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ انہیں اس پر ایمان ہے بلکہ ایسے حقائق ان کے نزدیک محض ایک افسانہ ہیں۔

قطع نظر اس امر سے کہ حقیقت دعاء کی تصدیق پر ہماری فطرت شاہد ہے کتاب اللہ اور سنت مگر نہایت زور کے ساتھ دعاء کی طرف بندوں کو بلاتی ہیں کتاب اللہ اور سنت میں ادعیہ ماثورہ کا وجود ہی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ بجز دعاء انسان کو کوئی چارہ نہیں اور صرف دعاء ہی سے انسان اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب پا سکتا ہے یہ بات صرف مذہب اسلام ہی سے خاص نہیں بلکہ تمام مذاہب عالم کا جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں یہ عقیدہ ہے مع ھذا ایک عام فطرت انسانی کا اس کی تائید میں ہونا قطعی حجت ہے ہم قرآن شریف سے چند ایک آیات کو ذیل میں نقل کر کے دکھاتے ہیں کہ دعاء مذہب اسلام میں کس قدر ضروری چیز ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ دعا ہی مذہب اسلام کا اعلیٰ مقصد ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ

toobaa-elibrary.blogspot.com

دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اس آیت میں نہایت صاف طور پر ارشاد ہوا ہے کہ میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں اور پھر فرمایا اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اس آیت میں صریح طور پر حکم ہے کہ میری بارگاہ کبریاء میں خشوع و خضوع کیساتھ رجوع کرو اور دوسری جگہ اس کو یوں واضح کیا وَاسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کی مہربانی کا سوال کیا کرو اور آیت اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ سے اس امر کا پتہ لگتا ہے کہ اضطرار یعنی بیچارگی کی حالت موجب اجابت ہے اور بے چارگی کو تضرع اور خشوع و خضوع لازم ہے۔ کیونکہ جس شخص کو اسباب سعی حاصل ہوں وہ نہ تو اپنے تئیں بیچارہ جانتا ہے۔ اور نہ اس میں خشوع و خضوع پیدا ہو سکتے ہیں۔

آیت قرآنیہ سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔ بلکہ بعض آیت سے یہ پتہ بھی لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا نہ کرنے پر ناراض ہوتا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ فَلَوْلَا اِذْ جَاءَھُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰکِنْ قَسَتْ قُلُوْبُھُمْ الآیۃ اس آیت کا اسلوب بیان ظاہر کرتا ہے کہ نزول عذاب پر تضرع نہ کرنا موجب غضب ہے۔ اور قساوت قلبی کو دور کرنا اور اس کی جگہ خشوع و خضوع کا پیدا کرنا خدا تعالیٰ کو منظور ہے۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا نہ کرنے پر ناراض ہوتا ہے اور آداب دعا میں مروی ہے کہ دعا کرتے وقت بندہ کو اجابت کا یقین ہونا چاہیے۔ اور وساوس و شکوک کو دل سے اٹھاوے۔ ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے لا ینبغی لا حدکم ان یقول اغفرلی ان شئت ولکن یلجرم المسئلۃ فیقول اللھم اغفرلی یعنی کسی شخص کو نہیں چاہیے کہ دعا کے وقت یوں کہے کہ خدایا اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے بلکہ حرف شرط سے جو شک کے لئے ہے اپنے سوال کو خالی کر کے یقین کے ساتھ یوں سوال کرے کہ خدایا مجھے بخش دے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا الدعا مخ العبادۃ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے پھر فرمایا الدعاء ھی العبادۃ یعنی دعا عبادت ہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعا عجز

عبادت کے اور کچھ نہیں اور بڑا حصہ عبادت کا دعا میں منحصر ہے۔ دعا بجائے خود ایک عبادت ہے جس میں عبودیت کا بدرجہ کامل اظہار ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ دیگر انواع عبادت سے ممتاز ہے کیونکہ عبودیت عجز و انکسار کی مقتضی اور ربوبیت کبریاء و جبروت کو چاہتی ہے لہذا جب بندہ غایت تذلل کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی غایت عظمت و جبروت کا تصور کرتا ہے تو اس کو بارگاہ مولیٰ میں ایک خاص قرب حاصل ہوتا ہے اور اس حالت قرب میں وہ ایک قسم کی تسکین اور اطمینان محسوس کرتا ہے اور یہ تسکین اور اطمینان علامت اجابت ہے۔ اگر حالت تضرع آنسو بھی جاری ہو جائیں تو یقین سمجھو کہ دعا ہرگز رد نہیں ہوگی۔ بعض آثار میں وارد ہوا ہے کہ قبول دعا کی یہی ایک صورت نہیں کہ مطلوب حاصل ہو جائے بلکہ اگر عطائے مطلوب داعی کے حق میں مناسب ہو تو اسے مطلوب دیا جاتا ہے ورنہ اس کے عوض میں کوئی اور بھلائی اس کو دی جاتی ہے یا کوئی آنے والی مصیبت ٹل جاتی ہے اور اگر ان سب صورتوں سے کوئی صورت نہ ہو تو داعی کے نامہ اعمال میں اور حسنات کے ذخیرہ رکھی جاتی ہے۔ بہر صورت یہ خیال باطل ہے کہ بعض وقت دعا مقبول نہیں ہوتی ہاں یہ صحیح ہے کہ دعا کسی خاص مطلوبہ صورت میں مقبول نہ ہو مگر ضائع نہیں جاتی کیونکہ وہ بندہ کا ایک عمل ہے اور عمل خواہ کچھ ہی ہو کبھی اکارت نہیں جاتا ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی دعا کو رد نہیں کرتا کہ وہ اکتا کر یوں کہنے لگتا ہے کہ میں نے بہت دعا کی مگر مقبول نہیں ہوئی۔ بندہ کو اکتانا نہیں چاہیے ممکن ہے کہ التواء میں کچھ مصلحت ہو۔ جس کا انکشاف سردست داعی پر نہیں ہوا۔ مگر بعد میں منکشف ہو جائے اس امر کو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ گو بلحاظ ظاہری اور باطنی حالات کے دعا کے لئے چند ایک شرائط اور لوازم ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ اس باب میں جو تضرع اور زاری کو دخل ہے اور کسی چیز کو نہیں قال اللہ تعالیٰ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَۃً کسی صاحب دل نے کیا عمدہ کہا ہے۔

toobaa-elibrary.blogspot.com

سرنوشت واژگوں را راست گرداند نیاز
نقش مکتوبِ نگیں از سجدہ مے گردد درست

تضرع اور ابتہال تمام مشکلات پر پانی پھیر دیتے ہیں۔ کما قیل

دلا بسوز کہ سوز تو کارہا بکند
دعائے نیم شبی دفع صد بلا بکند

قال المولوی المعنوی

ایکہ خواہی از بلا جان و اخری
جان خودرا در تضرع آوری
کایں تضرع رد حق قدرہاست
واں بیا کا نجاست زاری را کجاست

بہر صورت دعا کا منجملہ اسباب موثرہ کے مؤثر ہونا انسانی فطرت میں داخل ہے اور تمام کتب سماویہ اس کی صداقت پر شہادت دیتی ہیں اور تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ اور جس بے دین نے اس کا انکار کیا ہے اس نے در حقیقت قرآن مجید کا انکار کیا ہے۔ کما قال بعض المفسرین من طعن فی الدعا فقد طعن فی القرآن وابطلہ یہ خیال کہ دعا سے صرف ایک قسم کی تسلی مقصود ہوتی ہے۔ ورنہ اس کی کچھ تاثیر نہیں کیونکہ امور اپنے اسباب سے وابستہ ہیں۔ انہیں کے موجود ہونے پر وہ امور واقع ہوں گے۔ اس الحاد کا نتیجہ ہے کہ روحانی اسباب کی تاثیر سے قطع نظر کر لیا گیا ہے۔ انکار دعا کو پہلے پہل سید احمد خان علی گڑھی نے رواج دیا۔ بعد ازاں اس کے متبعین نیاچرہ نے گاہ بگاہ اس کے خیال فاسد کی تائید کی۔ اس انکار کے متعلق مفصلہ ذیل اعتراض سنے جاتے ہیں۔

(ا) اگر مطلوب کا ارادہ الٰہی میں واقع ہونا ضروری قرار پا چکا ہے تو دعا کرنا بے سود ہے۔ وہ خود بخود وقوع میں آرہے گا اور اگر اس کا وقوع ضروری نہیں تو پھر بھی دعا کچھ مفید نہیں۔ الغرض ہر دو صورت میں دعا ایک امر زائد ہے۔

(ب) جب اللہ تعالیٰ کی صفت یہ ہے کہ وہ علیم ذات الصدور ہے تو پھر دعا کی کیا ضرورت ہے بلکہ ترک دعا اولےٰ ہے۔

(ج) ایک حدیث میں یوں وارد ہوا ہے من شغلہ ذکری عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی السائلین یعنی جو شخص عرض حاجت کو چھوڑ کر میری یاد میں لگا رہتا ہے میں اسے عرض حاجت کرنے والوں سے بڑھ کر دیتا ہوں اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ترک دعا اولےٰ ہے۔

اس قسم کے اور بھی بعض اعتراضات کج فہم لوگ کیا کرتے ہیں مگر در حقیقت بوالفضولی کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ کسی امر کے ارادہ ذات باری میں مقدر یا اس کے علم میں ہونے کی وجہ سے ترک اسباب لازم نہیں آتا کیونکہ ممکن ہے کہ ارادہ الٰہی میں بذریعہ دعا ہی وقوع میں آنا مقدر ہو تعجب ہے کہ دعا کی ضرورت پر تو ایسے ایسے فضول اعتراض کئے جاتے ہیں مگر کسی عزیز کے بیمار ہونے پر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اگر اس کے لئے صحت کا ہونا مقدر ہے تو بلا معالجہ حاصل ہو رہے گی اور جو حصول صحت مقدر نہیں تو معالجہ بے سود ہے۔ جو لوگ سلسلہ سبب و مسبب کی حقیقت اور اس کی ضرورت سے آگاہ ہیں وہ کبھی اس خیال باطل پر دعا کو ترک نہیں کر دیتے اللہ تبارک و تعالیٰ کی مشیت ایسے مصالح خفیہ کے ساتھ جاری ہے کہ انسان عاجز اس کی سبت کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کسی صورت میں جاری ہو گی لہٰذا ہم پابندی اسباب سے جو طبعی امر ہے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے۔

تیسرے سوال کے متعلق اس امر کو دیکھنا ہے کہ آیا یہ حکم ہر حالت کے لئے ہے یا کسی خاص حالت سے مخصوص ہے الفاظ حدیث میں ذکر الٰہی اور سوال کا مقابلہ ہے اور اس میں ایک نفیس اور لطیف راز ہے اور وہ یہ ہے کہ ذکر الٰہی میں ایثار ہے یعنی اپنی حاجت کو چھوڑ کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی ثناء اور عظمت کا شمار اور سوال عرض حاجت کو کہتے ہیں جو ایک ذاتی غرض ہے لہٰذا ذکر کرنے والے کو عرض حاجت کرنے والے پر ترجیح ہے اور چونکہ مقام محبت ترک

toobaa-elibrary.blogspot.com

خواہش سے حاصل ہوتا ہے اس لئے ذاکر مقام محبت میں ہوگا اور دعا کرنے والا مقام ریاضت نفس میں ظاہر ہے کہ مقام محبت مقام ریاضت سے بالاتر ہے لہذا کوئی شخص مورد محبت بن کر جس انعام کا مستحق ہو سکتا ہے دوسری طرف اس کا مستحق نہیں ہو سکتا اب حدیث کے معنی صاف ہو گئے کہ جو شخص ذکر کو اختیار کر کے ترک دعا کرتا ہے وہ دعا کرنے والوں سے زیادہ انعام کا مستحق ہوتا ہے کیونکہ ذاکر مقام محبت میں ہوتا ہے اور سائل مقام ریاضت میں پس معلوم ہوا کہ حدیث مسطورہ بالا کا یہ مطلب نہیں کہ دعا کرنا بے سود ہے یا دعا کرنا مناسب نہیں بلکہ حضرت رب العزت نے ہر دو شخص کے مقام کا پتہ دیا ہے اور بتلایا ہے۔ ذاکرین سائلین سے زیادہ انعام پاتے ہیں۔

تنبیہ

واضح ہو کہ عوام الناس کے نزدیک سوال الفاظ سے مخصوص ہے یعنی بذریعہ الفاظ عرض حاجت کرنا مگر محققین کے نزدیک کسی شخص کا مضطرانہ حالت میں دل سے متوجہ الی اللہ ہونا ہی سوال ہے بلکہ کسی خاص حالت اضطرار کا اقتضا بلا توجہ بھی سوال ہے۔ آیت وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ میں لفظ سوال کے مفہوم میں انسان کے منفعیت فطرت داخل ہیں اور اتاکم کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا سلسلہ ایثار کو ایک خاص مناسبت اور ترتیب سے پیدا کر کے انسان کو ان کی طرف متوجہ کرنا بھی داخل ہے۔ فاحفظ فانہ لطیف

چونکہ دعا کا جزو اعظم وہ اسماء و صفات ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت و رحمت پر دلالت کرتے ہیں اور انہی اسماء و صفات کے ساتھ اس مالک حقیقی کو پکارنا چاہیے اس لئے ان کے علیحدہ علیحدہ معانی اور ان کے باہمی امتیاز کو خوب سمجھنا چاہیے تاکہ بوقت دعا ان کا تصور رہے کیونکہ خشوع و خضوع میں اس امر کو بڑا دخل ہے۔

الاسم الاعظم

اس مسئلہ پر بحث کرنا بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ علماء نے اس اسم شریف کی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اسم اعظم کوئی خاص معین اسم نہیں بلکہ ہر ایک اسم جس کا کوئی شخص ایسی حالت میں ذکر کرے جبکہ اس کی قوت فکریہ ماسوی اللہ سے منقطع ہو کر صرف ذات باری کی معرفت میں مستغرق ہو جائے اس ذاکر کے لئے اسم اعظم ہے اس دعویٰ پر وہ چند ایک استدلال پیش کرتے ہیں۔

اول یہ کہ اسم ایک کلمہ ہے جو مخصوص حروف سے مرکب ہوتا ہے۔ جس سے مسمی کا پتہ لگتا ہے اور اسم فی حد ذاتہ شریف نہیں ہو سکتا البتہ مسمی کی شرافت کے رو سے اسے بھی شریف کہہ سکتے ہیں اس لئے جب کوئی شخص کسی اسم سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرے تو چونکہ تمام اسماء کا مصداق ذات واحد ہے لہذا وہی اسم اس کے حق میں اسم اعظم ہوگا کیونکہ صرف ذات اقدس کے اعظم و کمل ہونے سے اس اسم کو بھی اعظم کہہ سکتے ہیں ورنہ تمام اسماء حروف سے مرکب ہونے میں برابر ہیں۔

دوم یہ کہ ذات باری واحد حقیقی ہے اس کے خارجی اور عقلی اجزاء نہیں ہو سکتے لہذا اس کے متعلق یہ خیال صحیح نہیں کہ بعض اسماء اس کی ذات کے جزو اشرف پر دلالت کرتے ہیں اور بعض کسی دیگر جزو اشرف پر اور جب یہ امر محال ہے تو تمام اسماء اس ذات واحد کامل پر یکساں طور پر دلالت کریں گے لہذا کوئی اسم کسی دوسرے اسم کی نسبت اعظم نہیں کہلا سکتا۔

سوم یہ کہ بعض آثار صحیحہ میں بھی مذکورہ بالا رائے کی تائید موجود ہے مثلاً حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کسی نے اسم اعظم کی نسبت دریافت کیا تو آپ نے اسے کہا کہ انہوں حوض میں غسل کرو۔ بعد ازاں تم اسم اعظم مجھ سے سیکھو۔ وہ شخص حوض میں داخل ہو کر غسل کرنے لگا۔ موسم زمستان تھا اور پانی

toobaa-elibrary.blogspot.com

یخ بستہ ہو رہا تھا۔ اس نے بہت جلد باہر نکلنا چاہا۔ امام ممدوح نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے باہر مت آنے دو۔ وہ شخص باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا۔ مگر وہ لوگ اسے پھر پانی میں دھکیل دیتے اس نے بہت منت سماجت کی۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ آخر اسے یقین ہو گیا کہ یہ لوگ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہیں تب اس نے نہایت یاس اور غایت زاری کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی رہائی کی التجا کی۔ ان لوگوں نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو انہوں نے فی الفور اسے باہر نکال لیا۔ اور کپڑے پہنائے کچھ دیر بعد جب اس میں کچھ طاقت آگئی تو امام صاحب سے عرض کیا کہ اب تو اسم اعظم سکھلا دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے تو اسم اعظم سیکھ لیا ہے اور وہ وہی اسم تھا جس کے ساتھ تو نے اپنے مولیٰ کو پکارا تھا۔ اور اس نے تیری التجا کو منظور کیا اس نے پوچھا وہ کیسے؟ امام صاحب نے فرمایا کہ اسماء ذات باری میں سے ہر ایک اسم غایت عظمت و جلالت رکھتا ہے اور انسان جب کسی اسم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو چونکہ دل سے اس کو تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف زبان پر لفظ جاری ہوتا ہے اس لئے اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا مگر جب اسی اسم کے ساتھ غایت میں اور اضطرار کی حالت میں غیر اللہ سے الگ تھلگ ہو کر پکارتا ہے تو وہی اسم اسم اعظم ہو جاتا ہے تمہیں جب غیر اللہ کی طرف سے ناامیدی ہو چکی تھی تو اسباب سے قطع تعلق ہو گیا تھا اور صرف اس مالک حقیقی کی رحمت پر توجہ محدود ہو گئی تھی لہذا جس اسم کے ساتھ تم نے اسے پکارا وہی اسم اعظم ہو گیا۔

اسی طرح مروی ہے کہ ایک شخص ابو یزید بسطامی کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے اسم اعظم کا پتہ دیجئے انہوں نے فرمایا کہ اسم اعظم کے لئے کوئی خاص حد معین نہیں اپنے قلب کو غیر اللہ سے پاک و صاف کر کے صرف اسی ذات مقدس کی طرف رجوع کرو۔ پھر جس اسم سے تم اسے پکارو گے وہی اسم اعظم ہو گا۔ غیر اللہ سے الگ تھلگ ہو کر ذات باری کو پکارنا اور ایسے وقت میں اسے جس اسم سے پکارا جائے اس کے ذریعہ دعا کا مقبول ہونا پایہ یقین کو پہنچ چکا ہے

اور اس میں راز صرف یہی ہے کہ جس قدر غیر اللہ سے قطع تعلق ہو جاتا ہے اسی قدر قلب کا تعلق ذات باری کے ساتھ بڑھ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اسم ایسی حالت میں بطور اتم موثر ثابت ہوتا ہے اسی خیال پر ایک محقق نے لکھا ہے کہ پورے طور پر انسان صرف اس وقت غیر اللہ سے الگ تھلگ ہوتا ہے جبکہ وہ نزع کی حالت میں ہوتا ہے اس حالت میں بجز اللہ تعالیٰ کے کسی شخص کی طرف سے اس کے دل میں خوف و رجا باقی نہیں رہ جاتے اس لئے ایسی حالت میں عاجز بندہ جس اسم کے ساتھ حضرت رب العزت کو پکارتا ہے وہ اس کے حق میں اسم اعظم ہو گا اور اس اسم کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کا کرم بندہ کے شامل حال ہو گا یعنی اس کو درکات عذاب سے رہائی دے کر درجات ثواب تک پہنچا دے گا اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ جناب نبوی کا فرمان مبارک من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ مذکور بالا تحت پر مبنی ہے فصلی اللہ علیہ وسلم

علماء کا ایک دوسرا گروہ ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم ایک خاص معین اسم ہے۔ پھر یہ لوگ بھی دو قسم کے ہیں ایک تو قائل ہیں کہ بندوں کو اس کا علم ہے دوسرے قائل ہیں کہ کسی کو اس اسم کا علم نہیں ہر ایک گروہ اپنے اپنے دلائل پیش کر کے اپنے دعویٰ کو ثابت کرتا ہے جو لوگ اس امر کے قائل ہیں کہ بندہ کو اس کا علم ہے۔ ان میں اختلاف ہے کہ وہ کونسا اسم ہے؟ بعض کا خیال ہے کہ وہ اس حو (علمائے حدیث میں سے شیخ ابن تیمیہ اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ حو اسم ذات باری ہے چہ جائیکہ وہ اسم اعظم ہو) اور مقام دعا میں یا ھو یا من لا ھو الا ھو یا من بہ ھویۃ کل ھو بولا کرتے ہیں مفصلہ ذیل دلائل کے رو سے یہ اسم اسم اعظم ہے۔

اول یہ کہ اسم حو کنایہ ہے ذات واحد سے جو بطور غیبت اور فردانیت کے موجود ہے غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذات تمام اشیاء سے علیحدہ ہے۔ یعنی وہ نہ کسی چیز میں نہ کسی چیز کے اوپر نہ کسی چیز سے متصل اور منفصل ہے اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

فردانیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر ایک جہت سے فرد مطلق ہے اور تمام صفات میں کامل و مکمل ہے لہذا اسم ھو کا اطلاق ذات باری پر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ وہ ان تمام صفات سے موصوف ہے جو اس کے شایان شان ہیں۔ لہذا اسم ھو اخص الاسماء قرار دیا گیا۔

دوم یہ کہ موجودات کا ایک خالق حقیقی کی طرف محتاج ہونا ایک ایسا واضح اور بین امر ہے کہ اس کے متعلق کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ایک امر فطری ہے یہی وجہ ہے کہ مشرکین اس سوال کے جواب میں کہ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا ہے بجز ذات باری کے کسی غیر کا نام نہیں لے سکتے تھے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اسم ھو سے ایک ایسے موجود حقیقی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے جس کی ضرورت پر انسانی فطرت شاہد ہے اور یہ اسم اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ موجودہ حقیقی اپنی ماہیت ذات کی جہت سے باطن (مخفی) ہے اور لحاظ دلائل کے ظاہر اس لئے یہ اسم اسم اعظم ہے۔

سوم یہ کہ عموماً قاعدہ ہے کہ سلاطین عظیم الشان کو اگرچہ متکلم سامنے موجود ہو بجائے صیغہ خطاب کے صیغہ غائب سے تعبیر کیا کرتے ہیں یعنی بجائے انت فعلت کذا کے ھو فعل کذا بولا کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ھو اعظم الکنایات قرار دیا گیا ہے۔

بعض دیگر کا خیال ہے کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے اور وہ اس کے متعلق چند وجوہ بیان کرتے ہیں اولاً اس اسم کا اطلاق بجز ذات باری کے کسی اور چیز پر نہیں کیا گیا کیونکہ اہل عرب اپنے معبودوں کو الٰہ کہا کرتے اور یہ اسم مبارک صرف ذات واحد سے مخصوص تھا۔ قال اللہ تعالیٰ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ اور پھر فرمایا هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا یعنی کوئی مخلوق ذات باری کا ہمنام نہیں کیونکہ وہ اسم اللہ سے موسوم ہے جو کسی غیر پر اطلاق نہیں پا سکتا چونکہ اس اسم کو ذات باری سے خصوصیت ہے اس لئے

اشرف الاسماء ہے۔

ثانیاً اسم اللہ دیگر اسماء ذات باری کی نسبت اصل ہے یعنی تمام دیگر اسماء کو اس اسم کی طرف مضاف کیا کرتے ہیں اور اسے مضاف الیہ قرار دیتے ہیں مثلاً یوں تو کہہ سکتے ہیں کہ رحیم، رحمن وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ہیں یوں نہیں کہا کرتے کہ بسم اللہ الرحمان الرحیم (سورۃ ابراہیم کی آیۃ الی صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ میں یا تو تقدیم و تاخیر ہے یعنی اِلٰى صِرَاطِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ الَّذِيْ یا موجب قرات نافع ولن عامر لفظ اللہ مرفوع مبتدا ہے اور الذی مع صلہ خبر مبتدا فلا اشکال) کا اسم ہے۔

ثالثاً آیت قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہر دو اسم بہ نسبت دیگر اسماء کے مخصوص ہیں اور ان ہر دو میں سے اسم اللہ اسم رحمان پر مقدم ہے اس لئے کہ اسم اللہ جامع جلال و جمال ہے اور اسم رحمان صرف جہت جمال پر مشتمل ہے لہذا اسم اللہ اشرف ہے رابعاً کافر کا اسلام لا الہ الا اللہ کہنے پر معتبر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر کسی دیگر اسم سے اظہار کرے تو نہیں اور یہ امر بھی اسم اللہ کے اشرف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

(خامساً آیۃ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اللہ دیگر اسماء کی نسبت اشرف ہے کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کو تمام غیر اللہ سے منقطع ہو جانے کی ہدایت کی ہے اور اسم اللہ کے ساتھ ذات باری کی توحید کامل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ لہذا یہ اسم اشرف الاسماء ہے۔

(سادساً) کتاب اللہ شریف کو پہلے اسم اللہ سے شروع کیا گیا ہے اور یہ بھی دلیل اس کے اشرف الاسماء ہونے کی ہے بعض علماء نے اس اسم کے اشرف الاسماء ہونے پر اور بھی دلائل قائم کئے ہیں ہم نے نظر باختصار انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔

علماء کا ایک تیسرا گروہ ہے۔ جو الحی القیوم کو اسم اعظم قرار دیتا

toobaa-elibrary.blogspot.com

ہے اور اس کے متعلق دو وجوہ بیان کرتے ہیں اول یہ کہ بروایت ابی بن کعبؓ مروی ہے کہ انہوں نے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اسم اعظم کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ اسم اعظم ان ہر دو آیت میں ہے۔ (ا) اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (ب) اَلٓمّٓ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ مگر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اسم اعظم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دیگر آیات میں بھی موجود ہے۔ اس لئے الحی القیوم ہی اسم اعظم ہے۔

اور ایک روایت میں جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اسم اعظم الحی القیوم ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ اسم صرف تین آیات میں مذکور ہے دو تو مسطورہ بالا آیات ہیں اور تیسری آیت ہے وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ دوم یہ کہ ان ہر دو اسم کے مفہوم میں تمام دیگر صفات کاملہ کا مفہوم داخل ہے یعنی ان اسماء کے ذکر کرنے پر دیگر صفات کے علیحدہ ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی لہذا یہ ہر دو اسم اعظم الاسماء ہیں۔

علماء کا ایک چوتھا گروہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَام اسم اعظم ہے لوازاس لئے کہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے الظوا بیا ذالجلال والاکرام یعنی ذوالجلال والاکرام پر جم جاؤ اور اس اسم کے ذکر کو لازم پکڑو یہی وجہ ہے کہ اکثر ادعیہ ماثورہ میں یہ اسم وارد ہوا ہے۔ (ثانیاً) یہ اسم تمام دیگر صفات الٰہیہ پر مشتمل ہے کیونکہ اس میں ہر دو قسم کے صفات جلال و جمال کا مفہوم داخل ہے۔ (اکرام صفات جمال کی طرف اشارہ ہے) علماء کا ایک پانچواں گروہ ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم حروف مقطعات قرآنیہ میں مذکور ہے چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آپ کسی مشکل کے موقع پر یوں دعا کیا کرتے یا کھیعص یا حم عسق اسی طرح سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حروف مقطعات کی دو صورتیں ہیں ایک تو ایسے حروف ہیں جن کی ترکیب سے کوئی اسم مرکب ہو سکتا ہے۔ مثلاً الرہ حم ھ ن کی ترکیب سے اسم الرحمان کی ترکیب ہو سکتی ہے دوم وہ حروف ہیں جن سے کوئی

ایسی ترکیب حاصل نہیں ہو سکتی اور اسم اعظم انہیں حروف میں محدود ہے ایک اور روایت میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کی بابت سوال کیا جس سے کہ دعا مقبول ہو جاتی ہے تو مجھے ایک رویاء میں بتلایا گیا کہ دعا میں یوں کہا کرو۔ اللھم انی اسئلک اللہ اللہ الذی لا الہ الا ھو رب العرش العظیم امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان الفاظ میں جب دعا کی مقبول ہوئی۔

یہاں تک ان مذاہب کا بیان تھا جن میں یہ مذکور ہے کہ اسم اعظم مخلوق کو معلوم ہے دوسرا گروہ ان علماء کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ اسم اعظم کا علم کسی کو نہیں اور اس کے مخفی رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ طالب جمیع اسماء حسنیٰ کا ذکر کرے اور اس کی مثال بعینہ لیلۃ القدر کی سی ہے۔

خاتمۃ الکتاب

واضح ہو کہ بعض اکابر مشائخ رضی اللہ عنہم کی زبان پر خاص خاص حالات میں ایسے کلمات بھی جاری ہوئے ہیں۔ جو بظاہر نصوص آیات و احادیث کے مخالف معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر علمائے اسلام نے بلا تاویل ایسے کلمات کہنے والے کی تکفیر کر دی ہے۔ مگر بعض محتاط حضرات نے توسع اور استعارہ پر نظر کر کے ایسے کلمات کا کوئی محمل صحیح قرار دیا ہے اور تکفیر سے اجتناب کیا ہے اور یہی مسلک اصوب و اسلم بھی ہے کیونکہ جب ہمیں قطعاً علم ہے کہ قائل جمیع کتاب و سنت اور صحیح العلم والعمل ہے تو صرف ایک ایسے جملہ سے جس میں توسع و استعارہ کو بہت وسیع دخل ہے ہم کیونکر تکفیر کر سکتے ہیں جو اصحاب حضرات مشائخ کے کلام میں اشارات و تلویحات اور تشبیہات و استعارات اور تمثیلات و کنایات کی حقیقت سے واقف ہیں وہ یقیناً ایسے جملوں کو جو بظاہر مخالف شریعت معلوم ہوتے ہیں ہرگز موجب زندقہ و الحاد قرار نہیں دیتے وجہ اس کی یہ ہے کہ سالک پر ہر ایک مقام ترقی میں ایسے معارف و اسرار

toobaa-elibrary.blogspot.com

کا انکشاف ہوتا ہے جو کسی پہلے نچلے مقام سے کہیں زیادہ دقیق و عمیق ہوتے ہیں اس لئے کوئی الفاظ ایسے نہیں جو ان حقائق کو اصلی صورت میں ظاہر کر سکیں لا محالہ ان کیفیات یا حقائق کے اظہار کے لئے مجازات و کنایات کی ضرورت پڑتی ہے اور بسا اوقات تشبیہ و تمثیل سے کام لیا جاتا ہے کوتاہ فہم اور ناقص الادراک لوگ ذوق معانی سے بے بہرہ ہوتے ہیں حقیقت اصلیہ پر نہ آگاہ ہو کر حضرات مشائخ کے بارے میں زبان طعن کھول دیتے ہیں مگر خاکسار مولف عرض کرتا ہے کہ مقتضائے

چو شنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

جب تک کوئی شخص خود صاحب مقام نہ ہو اسے نہ تو تصدیق کرنا چاہیے اور نہ تکذیب نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم اپنی کتاب قطوی دیل الطالب کے ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ امام شوکانی نے اپنے ایک رسالہ میں حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمہ اللہ کی تکفیر کر کے چالیس سال کے بعد رجوع کیا اور یہ لکھا کہ میں نے فتوحات مکیہ میں غور کر کے شیخ اکبر کے کلام کا محمل صحیح بطریق تاویل سمجھ لیا اور اب میں اپنی سابقہ تحریر سے توبہ کرتا ہوں چنانچہ وہ عبارت حسب ذیل ہے (یقول مولف هذه الرسالة غفر الله له هو تائب الی الله من جمیع ماحرره فیها مما لا یرضی الله عزوجل وقد طالعت بعد تالیفها الفتوحات والفصوص فرأیت ماللتاویل فیه مدخل لاسیما عند هولاء الذین هم خلاصة الخلاصة من عباد الله عزوجل و کان تحریر هذا بعد تحریر الرسالة بزیادة علی اربعین سنة) اور کچھ شک نہیں کہ معارف و حقائق کے لئے مدارج ہیں جو ہر ایک نااہل کی مجلس میں قابل بیان نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ سید الطائفہ جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ خاص خاص معارف و حقائق کے بیان کرتے وقت بجز مسترشدین اہل مقام کے دوسروں پر مکان کا دروازہ بند کر دیا کرتے کیونکہ نااہل لوگ تصور

فہم کی وجہ سے فی الفور تکذیب و تکفیر پر آمادہ ہو جایا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض آثار میں وارد ہوا ہے۔ تکلموا الناس علی قدر عقولهم یعنی لوگوں سے ان کے مدارج عقول کو ملحوظ رکھ کر خطاب کیا کرو جامع بخاری میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ مروی ہے حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب الله ورسوله یعنی لوگوں سے وہ کلام کرو جس کو وہ سمجھ سکیں کیا تم پسند کرو گے کہ لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کر دیں اس سے معلوم ہوا کہ توحید ذات باری اور مبداء و معاد عالم اور عالم ملکوت اور حقیقت روح وغیرہ مسائل دقیقہ و عمیقہ کے متعلق عوام الناس میں ہرگز کوئی بحث نہیں کرنی چاہیے ورنہ بجائے فائدہ کے لوگوں کے عقائد میں تزلزل اور فساد عائد ہو گا وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ مادیات اور لوازم مادیات سے بالاتر حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ تعلیم وحی میں بھی اشارات ہی سے کام لیا گیا ہے اگر تصریح ہوتی تو معیار عقائد کا قائم کرنا ناممکن تھا بخاری بروایت مقبری عن ابی ہریرۃ رضی ہیں حفظت من رسول الله صلی الله علیه وسلم وعائین فاما احدهما فبثثته واما الاخر فلو بثثته قطع هذا البلعوم یعنی میں نے جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دو قسم کے علم کو ضبط کیا ہے ایک قسم کا اظہار تو میں نے کر دیا ہے اور دوسری قسم کا اگر اظہار کروں تو میرا گلا کاٹ دیا جائے اس کے متعلق بعض شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ دوسری قسم سے جو ناقابل اظہار ہے وہ احادیث مراد ہیں جو ان اہل جور و ستم کے حالات اور اظہار اسمائے اور مذمت پر مشتمل تھیں جو حضور علیہ السلام کے بعد دین میں فتنہ و فساد کا موجب ہوتے رہے مگر خاکسار مولف عرض کرتا ہے کہ یہ حضرات شارحین کا اپنا قیاس ہے ورنہ صحیح یہ ہے کہ ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ایسے معارف و حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے لفظ کرنے سے عام لوگوں کے فہم قاصر ہیں اور خود امام بخاری کا اس حدیث کو کتاب العلم میں بیان کرنا مذکورہ بالا معارف و حقائق سے مراد لینے پر ایک پختہ قرینہ ہے ورنہ بلحاظ مناسبت مقام

toobaa-elibrary.blogspot.com

ضروری تھا کہ اس حدیث کو کتاب الفتن میں لکھتے یہاں یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا کہ اگر ہم ظواہر احکام شریعت کے سوا معارف و حقائق باطن کا اقرار کریں تو فرقہ باطنیہ کے مذہب کی تائید ہو گی کیونکہ باطنیہ کے عقائد ایسے باطن پر مبنی ہیں جو ظواہر شریعت کو باطل کرتے ہیں مگر وہ حضرات مشائخ جو کتاب و سنت کے بدوں ایک قدم چلنا بھی حرام جانتے ہیں اور مخالف شریعت کو دشمن خدا اور رسول سمجھتے ہیں باطنیہ ملاحدہ کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے چنانچہ ابن حجر فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھتے ہیں قال المنیر جعل الباطنیة هذا الحدیث ذریعة الی تصحیح باطلهم حیث اعتقدوا ان للشریعة باطنا وظاهرا و ذلك الباطن انما حاصله الانحلال من الدین یعنی باطنیہ فرقہ کے لوگوں نے اس حدیث سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور یہ باطن ایسا ہے جس سے شریعت کا تار و پود ہی اڑ جاتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایسا باطن جو منافی ظاہر شریعت ہو کفر و الحاد ہے مثلاً باطنیہ کا خیال ہے کہ نماز پنجگانہ سے آئمہ اہل بیت کے پانچ آدمی مراد ہیں اسی طرح وہ تمام احکام کی حقیقت کو باطل کرتے ہیں سو معاذ اللہ کہ اکابر حضرات مشائخ اس قسم کے الحاد کے قائل ہوں دیکھو ابن حجر کے لفظ و ذلك الباطن سے وہی باطن مراد ہے جو منافی شریعت حقہ ہے نہ یہ کہ معارف و حقائق کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہو سکتا جو حضرات مشائخ کو مقام مکاشفہ و مشاہدہ میں حاصل ہوتا ہے غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ معارف و اسرار توحید کی اصلیت کا انکار کرنا منشاء شریعت کے منافی ہے کیونکہ حقیقت توحید کے مختلف مقامات ہیں اور انہیں میں عارف کو سیر حاصل ہوتی ہے بھلا باطنیہ ملاحدہ کو اس لذت بیش بہاء سے کیا تعلق؟ صاحب کتاب نور الابصار فی مناقب آل بیت النبی المختار شیخ عبدالجواد شبرینی کی کتاب درالصداف فی مناقب الاشراف سے نقل کرتے ہیں کان علی بن الحسین عاملا علی کتمان اسرار الله تعالی فی العالم کما اشار الی ذلك فی قوله رضی الله عنه

یارب جوهر علم لو ابوح به
لقیل لی انت ممن یعبد الوثنا
ولاستحل رجال صالحون دمی
یرون اقبح ما یاتونه حسنا

یعنی امام زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہما اسرار توحید کے اخفاء پر عامل رہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ "ایسے بہت سے علوم ہیں کہ اگر میں ان کا اظہار کروں تو لوگ مجھے مشرک (بت پرست) کہہ دیں اور حضرات علماء امت میرا خون جائز رکھیں اور بدترین سلوک کو میرے حق میں اچھا سمجھیں" اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ نے کمیل بن زیاد نخعی کو ایک خطاب میں یوں فرمایا" ها ان ههنا لعلما جما (وارشار الی صدره) لو اصبت له حملة یعنی سنو! کہ یہاں (میرے سینہ) میں بے پایاں علم ہے کاش! میں کسی کو اس کا اہل پاتا۔ کیا اس علم سے احکام فقہ مراد ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ حضرات صحابہ میں اس علم کے ماہر ہزاروں موجود تھے اور کیا کوئی دوسرے علوم دینیہ مراد ہیں؟ ہرگز نہیں کیونکہ یہ علوم بھی آپ سے مخصوص نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان علوم سے اسرار توحید مراد ہیں نہ کچھ اور۔

دیکھو علم مترادف یقین ہے اور قرآن مجید میں یقین کے مدارج مذکور ہیں اور وہ مدارج بہ ترتیب علم الیقین۔ عین الیقین حق الیقین کے الفاظ سے ظاہر کئے گئے ہیں ایسا کون بیوقوف ہے جو ان ہر سہ مراتب یقین میں امتیاز نہ کر کے علوم حقہ باطنیہ کا انکار کر دے اور یہ کہہ دے کہ بجز ان علوم شرعیہ کے جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں کوئی اور علوم دائرہ شریعت میں داخل نہیں۔ یقین ایک کیفیت باطنی کا نام ہے پس از روئے قرآن مجید ثابت ہو گیا کہ علوم شرعیہ کی دو صورتیں ہیں اول وہ جو ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں اور دوم جو باطن سے متعلق ہیں اور ان ہر دو میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے یعنی علوم شرعیہ جو ظاہر سے تعلق

toobaa-elibrary.blogspot.com

رکھتے ہیں اور ملزوم ہیں علوم باطنیہ لازم۔ اگر ملزوم کا وجود نہ ہو تو لازم خود معدوم ہو گا اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ بدوں پابندی احکام شرعیہ کوئی شخص معارف و حقائق کا مالک نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ اکابر مشائخ رضی اللہ عنہم بالاتفاق اس امر کے قائل ہوئے ہیں کہ جو باطن منافی ظاہر شریعت ہے وہ زندقہ والحاد ہے اور جو طریق سلوک کتاب و سنت سے وابستہ نہیں وہ شیطان کا طریق ہے اور اس خیال کے تمام اکابر سلف نے امت مرحومہ تک تبلیغ کر دی ہے اس لئے اگر کوئی شخص علوم باطن کا انکار کرے تو وہ جاہل و مغرور ہے اور جو شخص ظاہر شریعت کا انکار کر کے باطن کا مدعی ہو وہ ملحد و زندیق ہے ہمیں اس موضوع پر بحث کرنے کی ضرورت دامن نہ ہوتی اگر ہم اہل زمانہ میں ایسے لوگوں کو نہ دیکھتے جو یا تو سلسلہ باطن کے منکر ہیں اور اس لئے حضرات مشائخ کی نسبت سوء ظن رکھ کر حصول سعادت سے محروم رہتے ہیں یا ایسے لوگ جو ظاہر شریعت کی پابندی سے دست بردار ہو کر مدعیان معرفت ہیں اور در حقیقت ہر دو گروہ باطل پرست ہیں اور اہل حق صرف وہ ہیں جو پابندی کتاب و سنت مقام مکاشفہ و مشاہدہ تک ترقی کرتے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے وجہ انکار بجز جہالت کے اور کچھ نہیں غلط فہمی سے ان لوگوں کو جو علوم شرعیہ رسمیہ کو پڑھ کر مناظرہ و مجادلہ پر کمر بستہ رہتے ہیں معارف و اسرار باطن کا مالک بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور اہل باطن کو خیال باطل مخالفان شریعت تصور کیا جاتا ہے اگرچہ وہ کتاب و سنت سے سر مو مخالفت کو بھی حرام جانتے ہیں مگر چند ایک احادیث کی بناء پر جن کی توجیہ صحیح سے یہ منکرین بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ایسے حضرات کے فیض صحبت سے مستفیض نہیں ہوتے اور مقولہ لکل فن رجال پر غور نہیں کرتے خضر و موسیٰ کا واقعہ اثبات باطن پر کافی دلیل ہے۔ اکثر حضرات مشائخ کرام کے بعض اقوال پر بھی نکتہ چینی کی جاتی ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ اکابر ارباب معرفت اہل رسم اور الفاظ پرست لوگوں کے مطاعن سے محفوظ رہے ہوں غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ چونکہ ولایت کبریٰ مستلزم جمیع کمالات حقہ

ہے کیونکہ اس کے انوار مشکوٰۃ نبوت سے اقتباس کئے جاتے ہیں اس لئے یہ حضرات مجرمان ظاہر بین کے انکار و تشنیع کا مورد اسی اتباع نبوت میں بنا کرتے ہیں اور متحمل بھی ہوتے ہیں اور صحیح طور پر یہی فرقہ عالیہ بارگاہ رب العزت میں عزت و کرامت کے تاج اور ظاہری و باطنی کمالات کے بیش بہا خلعت سے سرفراز ہوتا ہے جو سعادت مندان کے دامان نسبت سے وابستہ ہو گئے منزل مقصود کو پہنچ گئے اور جو خود پرست الفاظ کے جوڑ توڑ میں غلطاں و پیچاں رہ کر سوء ظن کے مقام میں پڑے رہے محروم رہ گئے یہ الٰہی دولت ہے کسی کے باوا کی میراث نہیں اور نہ تو وہ در تودہ کتب رسمیہ کے علم پر موقوف ہے اور نہ یہاں بحث و جدل کا کام ہے بلکہ اول قدم اس دشوار گذار راستہ میں وہی اٹھا سکتا ہے جو بحث و جدل کو بالائے طاق رکھ کر حسن ارادت کے مرکب راہوار پر سوار ہو۔

این نعمت بیدلی بہر دل نہ بند
وین نزل محنتان منزل نہ بند
در عالم عشق آنچہ بے عقلاں راست
یک ذرہ بصد ہزار عاقل نہ دہند

ہاں یہ ضروری ہے کہ طالب ایسے لوگوں کے دام تزویر سے بچتا رہے جو باس سنت اور پیرایہ شریعت سے عاری ہوں اور جن کے عقائد سلف صالحین کے عقائد کے ساتھ مطابق نہ ہوں کیونکہ ہمارے زمانہ ناہنجار میں بہت سے ہوسناک ایسے نکل آئے ہیں جو بڑے بڑے دعاوی کے ساتھ عوام الناس کو راہ راست سے گمراہ کر رہے ہیں اور سلف صالحین کے طریق سے جن سے بڑھ کر کوئی شخص متبع سنت نہیں ہو سکتا کوسوں دور جا پڑے ہیں اس لئے میں اس رسالہ کے ناظرین کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ رجوع الی اللہ کرنے سے پہلے اس ضروری امر کا فیصلہ کر لیں کہ وہ طریق شغل و ذکر جس کے بغیر سلوک کے منازل طے نہیں ہو سکتے کس شخص سے حاصل کر سکیں گے ظواہر احکام شرعیہ کی پابندی میں جو شخص حضرات آئمہ اربعہ رضی اللہ عنہم کے طریق اجتہاد سے ماہر ہو اور

toobaa-elibrary.blogspot.com

خود آیات و احادیث سے بر خلاف آئمہ مجتہدین کے استنباط کرنے کا مدعی ہو اور قرآن و سنت کے بعد سلف صالحین کے قول و فعل کو اپنا شعار نہ بنائے۔ جان لینا چاہیے کہ اس کی صحبت زہر ہلاہل سے کم مضر نہیں ہو گی کیونکہ مشیت ایزدی کے مطابق جب تک دین میں فتنہ و فساد کا دروازہ نہیں کھلا تھا لوگوں کو بوجہ غایت حق پسندی و سلامت روی کے کسی خاص معیار اجتہاد کی ضرورت نہ تھی اس لئے طالب حق کو اکتساب احکام فقہیہ کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی مگر جب اسلام میں فتنہ و فساد کو دخل ہونے لگا اور عقائد و احکام کی صورت بدلنے لگی تو احادیث نبویہ کی تدوین اور احکام فقہیہ کی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ حضرات اکابر دین کی مساعی جمیلہ سے حدیث و فقہ کی تدوین و ترتیب مکمل ہو گئی اور مسلک شریعت متعین ہو گیا اور تمام مسائل شرعیہ اجتہادات حضرات آئمہ اربعہ کے دائرہ میں محدود ہو گئے اور طالبان حق کے لئے سہولت پیدا ہو گئی اگر ایسا نہ ہوتا تو آج تک فقہ اسلامی بایں جامعیت و وسعت ہرگز محفوظ نہ رہ سکتی زمانہ انقطاع اجتہاد کے بعد کوئی محدث کوئی فقیہ کوئی شیخ کامل کوئی محقق علوم دینیہ ایسا نہیں گذرا جس نے حضرات ائمہ اربعہ جزاہم اللہ جزاء موفورا کے طریق اجتہاد کا اتباع نہ کیا ہو اب اگر کوئی بوالہوس منہ بنا کر اس کا انکار کرنے لگے تو بجز اس کے کہ وہ اپنی شقاوت کا اظہار کرے اور کیا سمجھا جائے گا ایسے لوگوں کی بات کو ایک کان کے لئے بھی نہیں سننا چاہیے اب رہا مقامات سلوک کو ارباب سلوک سے حاصل کرنا سو اس کے متعلق یوں سمجھنا چاہیے کہ جب تک طریق ذکر مطابق کتاب و سنت کے کسی اہل تقوی سے حاصل نہ کیا جائے مقامات کا طے کرنا ممکن نہیں اور اہل تقوی بجز متبعین حضرات مشائخ کرام کے صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود پایہ اجتہاد رکھنے کے علاوہ صاحب مقام بھی ہو اور اسے کسی صاحب مقام سے نسبت حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور ایسی نسبت کے ساتھ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامان محبت سے وابستہ ہو مگر ایسے لوگوں کا وجود شاذ سمجھا گیا ہے اس لئے اسلم طریق یہ ہے کہ

کسی ایسے صاحب کمال کی تلاش کی جائے جس نے خود کسی طریق معروف اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق مقام استقامت حاصل کیا ہو جس کی شناخت یوں ہو سکتی ہے کہ وہ ضروری علم کتاب و سنت رکھتا ہو اور دائرہ فقہ مجتہدین سے قدم باہر نہ رکھے اور رجوع خلائق کے درپے نہ ہو بلکہ اس سے نفرت رکھتا ہو اور لوگوں سے زر و سیم کو قبول نہ کرے اور اگر کوئی شخص بر طریق سنت ہدایا و تحائف پیش کرے تو اسے فی الفور مستحقین پر صرف کر دے اور مجالس اہل دنیا میں بجز کسی نیت شرعی کے ہرگز داخل نہ ہو اور امراء و مساکین کا امتیاز اس کی مجلس میں ہرگز نہ کیا جائے اور کسی بدعت اعتقادی یا عملی میں مبتلا نہ ہو اگر ایسا شخص مل جائے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے مگر حق یہ ہے کہ ایسے اصحاب کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں اور اگر ایسا صاحب ارشاد نہ مل سکے تو نوافل و اذکار مسنونہ کو لازم پکڑ لے اور ان میں فروگذاشت نہ کرے کیونکہ پابندی سنت عامل کے قلب کو نور معرفت سے منور کر دیتی ہے مگر اس صورت میں کچھ زیادہ مجاہدت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔

واضح ہو کہ سالک کو مقامات توحید کے طے کرنے میں بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جن میں وہ شعور خارجی سے بالکل بے خبر ہو جاتا ہے بلکہ اس سے آگے ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جس میں اس کو اپنی ذات کا شعور بھی نہیں رہتا حتی کہ وہ عدم شعور کے شعور سے بھی بے بہرہ ہو جاتا ہے ایسے حالات میں جبکہ انوار جلال و جبروت اس پر غالب آکر اس کے آثار انانیت کو مضمحل اور ناپدید کرتے ہیں اور مقام مشاہدہ حق میں جمعیت کلی سے متصف ہو جاتا ہے تو بسا اوقات اس کی زبان پر ایسے کلمات جاری ہونے لگتے ہیں جو عوام الناس کے دلوں میں حلول و اتحاد کا خیال پیدا کر دیتے ہیں حالانکہ ایسے حضرات حلول و اتحاد ہر دو سے بیزار اور ان کے قائل کی تکفیر کے قائل ہوتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ عبد خواہ کسی مقام تک ترقی کر جائے مگر پھر بھی وہ عبد ہی رہتا ہے کیونکہ ذات ممکن کبھی واجب نہیں ہو سکتی اور نہ واجب کبھی ممکن ہو سکتا ہے

toobaa-elibrary.blogspot.com

مادیات میں اس کی مثال یوں سمجھو کہ لوہا آگ کے قرب میں آگ کے خواص کو اس حد تک قبول کر لیتا ہے کہ اس میں آگ کے قرب میں آگ کے خواص کو اس حد تک قبول کر لیتا ہے کہ اس میں آگ ہی کے خواص لون' احراق وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں مگر وہ کبھی آگ نہیں ہو سکتا اسی طرح عبد کامل کے لئے عین صفات ذات باری کا حصول محال عقلی ہے ہاں ان صفات کے متناسبہ حالات عبد کو حاصل ہو سکتے ہیں جن پر صرف بطور اشتراک اسی وہی الفاظ بولے جاتے ہیں جو صفات ذات باری پر مگر ان ہر دو یعنی صفات ذات باری اور صفات عبد کی حقیقت ایک نہیں ہوتی بلکہ ان میں ہر ایک جہت سے امتیاز کلی ہوتا ہے کیونکہ صفات باری قدیم اور ذاتی اور کامل اور صفات عبد حادث اور معلول اور ناقص ہیں عبد ہر ایک صفت کا مظہر ہو کر آثار صفات کا متحمل ہو سکتا ہے مگر وہ عین صفات باری کا حصول ناممکن ہے کیونکہ واجب و ممکن کا ایک ہونا یا واجب کا ممکن میں حلول کرنا یا صفات واجب کا منتقل ہو کر عبد کے صفات قرار پانا بروئے دلائل قطعیہ محال ہے اس لئے معلوم ہوا کہ جو کلمات بعض اکابر کی زبان پر غلبہ سکر کی حالت میں جاری ہوتے ہیں ان کی توجیہ صحیح یہ ہو سکتی ہے کہ وہ حضرات ان کلمات کو حیثیت ذات باری سے ناقل ہونے کے زبان پر لاتے ہیں اور اس نقل سے بجز اس کے اور کوئی بات متصور نہیں ہو سکتی کہ محبوب کے کلمات کو استلذاذاً زبان پر لایا جاتا ہے چنانچہ جملہ سبحانی ما اعظم شانی یا جملہ انا الحق وغیرہ کی صحیح توجیہ یہی ہو سکتی ہے کیونکہ کسی متبع شریعت کی نسبت یہ خیال بھی صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ حالت صحت عقل و حواس اپنے تئیں خدائے خالق السموات والارض کہنے لگ جائے چنانچہ ابویزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت مروی ہے کہ آپ جب مطلع ہوتے کہ حالت سکر کوئی ایسے کلمات آپ کی زبان پر جاری ہوئے ہیں تو آپ مستر شدین کو کہا کرتے کہ تم لوگوں نے کیوں مجھے نہیں روکا؟ اور بعض اکابر نے ایسے کلمات کی یہ توجیہ بھی کی ہے کہ عارف کامل جب عین شہود کے ساتھ اپنا مقام حقائق کو نیہ محسوسہ سے بالاتر دیکھ

پاتا ہے تو حالت غلبہ سکر اپنے قدس کا اظہار کرتا ہے مگر وہ یہ جانتا ہے کہ قدس ذات باری کہیں اس سے بھی بالاتر ہے جس کے ساتھ اسے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی پھر ایسے کلمات مجاز کی طرف لائے جا سکتے ہیں ورنہ ان کا حقیقت پر محمول کرنا کفر صریح ہے کیونکہ صورت حقیقت اس عقیدہ اور نصاریٰ کے عقیدہ الوہیت مسیح میں کچھ فرق نہیں رہتا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ قلب عارف جب ہر ایک غیر اللہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو وہ انوار توحید سے منور ہو کر انوار کا حکم حاصل کر لیتا ہے جیسے آگ اور لوہے کی مثال میں اوپر بیان ہوا مگر وہ ہر دو ایک نہیں ہو سکتے دیکھو ایک شاعر اس کو محسوسات خارجیہ میں کیونکر ادا کرتا ہے؟

رق الزجاج و رقت الخمر فتشابها فقضا كل الأمر
فكانما خمر ولا قدح وكانما قدح ولا خمر

(بلور کا پیالہ اور شراب ہر دو ایسے لطیف و نازک ہیں کہ ہر دو میں بوجہ غایت مشابہت امتیاز جاتا رہا سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ شراب ہے اور پیالہ کوئی چیز نہیں یا پیالہ ہے شراب کوئی چیز نہیں)

جب مادیات میں یہ تشابہ مروج ہے تو روحانیات جن میں غایت تناسب ہے بدرجہ اولے اس تشابہ کے مستحق ہیں مگر اس تشابہ سے ہر دو کا متحد ہونا لازم نہیں آسکتا۔

پس جب حضرات اکابر کے کلام میں اس قسم کا کوئی جملہ پایا جاوے تو اس کو اس قسم کے مجاز و استعارہ پر محمول کر کے توجیہ صحیح پیدا کرنی چاہیے اور ظن فاسد سے بر کنار رہنا اصوب و اسلم ہے اس بحث کو امام غزالی رحمہ اللہ نے مقصد اسنیٰ میں اور شیخ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح کی دوسری جلد میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اس قسم کی مجازات بعض آیات قرآنیہ و کلام انبیاء میں بھی واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ یا مسیح علیہ السلام کا قول من رانی فقد رای ابی یا حدیث من رانی فقد رای الحق

toobaa-elibrary.blogspot.com

وغیرہ ذالک بعض اہل معرفت کے کلام میں بھی یہ طریق بیان پایا جاتا ہے مثلاً

ساکن فی القلب یعمرہ فلست انساہ فاذکرہ

(یعنی محبوب میرے قلب میں ساکن ہو کر اس کو آباد کرتا ہے میں اسے بھولتا ہی نہیں کہ مجھے یاد کی ضرورت پڑے)

ایک اور عارف کا کلام ہے

اذا سکن الغدیر علی صفاء
وجنب ان یحرکہ • النسیم
بدت فیہ السماء بلا امتراء
کذاک الشمس تبدو والنجوم
کذاک قلوب ارباب التجلی
یری فی صفوھا اللہ العظیم

(یعنی جب تالاب کا پانی صاف ہو اور ہوا کی موجیں بھی اسے حرکت نہ دیتی ہوں تو اس میں آسمان اور ستارے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح جب عارف کا قلب ماسوی اللہ کے غبار کے تعلق سے پاک ہو جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ نظر آتا ہے) کسی اور کا کلام ہے

انا من اھوی ومن اھوی انا

جس کا فارسی ترجمہ یہ ہے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

بہر صورت مذکورہ بالا امثلہ اور ان کی طرح اور اشعار یا جملے بھی کسی حقیقت پر محمول نہیں ہو سکتے کیونکہ حقیقت پر حمل کرنے کی صورت میں کفر صریح لازم آتا ہے اس لئے جمیع اہل تحقیق کے نزدیک ان کی صحیح توجیہ یہی ہو سکتی ہے کہ غلبہ انوار توحید کی وجہ سے جب آثار بشریت مضمحل ہو کر عارف کی نظر سے ناپید ہو جاتے ہیں اور مقام مشاہدہ میں ماسوائے اللہ سے بالکل تجرد

حاصل ہو جاتا ہے تو بر طریق غایت استلذاذ آپنے اس تعلق کو ظاہر کرتے ہیں جو انہیں محبوب حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ جس طرح مادیات میں دو متناسب چیزیں باہمی اتصال سے مثل واحد کے ہو جاتی ہیں تو حقائق مجردہ میں ہر دو کا مثل واحد ہونا کہیں زیادہ متصور ہو سکتا ہے مگر یہ محال ہے کہ ہر دو ایک ہو جائیں یا ایک دوسری میں حلول کر جائے لیکن غیر مادی حقائق مجردہ) کی نوعیت تعلق کو ہم لفظوں میں ہرگز نہیں سمجھ سکتے اس لئے اس عقیدہ صحیحہ کو کہ واجب اور ممکن دو علیحدہ علیحدہ حقیقتوں کا نام ہے ہر حال میں اپنا شعار سمجھنا چاہیے اور جہال متصوفہ کے خیالات باطلہ سے کوسوں دور بھاگنا چاہیے کیونکہ اسلام کو رائے حسن ظن کی سخت مذمت کرتا ہے بعض مدعیان مقامات میں اہل علم پر یوں طعن و تشنیع کیا کرتے ہیں کہ علماء ظاہر کو یہ پایہ نصیب نہیں کہ وہ مقربان بارگاہ صمدیت کے مقامات کو سمجھ سکیں اس لئے اولیاء کا یہ لوگ انکار کیا کرتے ہیں سو ایسے جہال مرفوع القلم ہیں اور عوام الناس کے لئے موجب فتنہ کیونکہ مقربان بارگاہ میں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا جس نے خلاف شریعت کسی عقیدہ کی اشاعت کی ہو کتاب و سنت دو شاہد عدل ہیں سو جو بات ان کے معیار شہادت پر صحیح نہیں اس میں خیر و عافیت نہیں بالآخر میں اپنے مسلمان بھائیوں سے استدعا کرتا ہوں کہ طریق راستی یہ ہے کہ انسان کو کسی امر میں غلو اور اصرار نہیں کرنا چاہیے اگر کسی امر کی نسبت معلوم ہو کہ وہ شریعت حقہ کے نصوص کے برخلاف ہے تو اس کی تکذیب و ابطال ہر ایک مسلمان کا فرض ہونا چاہیے اور اگر کوئی امر مختلف فیہ ہو تو اس میں دوسرے فریق کی تکذیب کرنا موجب خطر ہے ایسے امور میں صحیح طریق یہ ہے کہ اگر خود بروئے دلائل صحیحہ فیصلہ نہ ہو سکے تو علمائے راسخون فی العلم کے طریق کو اختیار کرنا چاہیے اور بزرگان دین کی جو صاحب مقام ہوں مخالفت کرنے سے بچنا چاہیے۔ کیونکہ بسا اوقات انسان اپنی کم علمی کی وجہ سے کسی حقیقت کی تکذیب کرنے لگ جاتا ہے کما قیل

وکم من عائب قولاً صحیحا

toobaa-elibrary.blogspot.com

واقفه من الفهم السليم

ایسے حالات میں اگر تصدیق نہ کر سکے تو تکذیب بھی نہیں چاہیے بلکہ سکوت اختیار کرنا اسلم ہے لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا فقط

خاکسار اس موضوع میں کچھ زیادہ بحث کرتا اور بعض دیگر مسائل ضروریہ کو بھی قلمبند کرتا مگر اہل زمانہ سے قبول حق کی توقع نہیں کیونکہ وہ اپنے مسلمات سے علیحدہ ہو کر استماع حق نہیں کر سکتے لہذا اسی قدر پر اکتفا مناسب سمجھا گیا۔

من ہمچو خواب دیدہ و عالم تمام کر
من عاجزم ز گفتن و خلق از شنیدنش

وکفی باللہ شہیدا" واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وعلی الہ واصحابہ وازواجہ اجمعین فقط

ربیع الاول۔ ۱۳۳۰ ہجری المقدس

ومما قلت مرتجلا فی وصف الکتاب العزیز

رویدکم واللی بعض الملام
فمالی لیس بحرج بالحمام

"تو میری ملامت کرنے والیوں! اپنی ملامت کو کچھ چھوڑو، کیونکہ میں جس حالت (عشق) میں مبتلا ہوں وہ موت سے بھی دور نہیں ہو گی"

اطعت مولیہ للہین العیش دھرا
فماعا شموت الا للسام

"میں ایک زمانہ بھر خوش زندگی کے پیچھے مارا مارا پھرا، سو میں نے جو زندگی بسر کی اس کا نتیجہ حال دیکھا"

وکیف یطیب عیش المرء یوما
اذا مالم یکن لیظ الثام

"انسان کو بھلا خوش زندگی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے، جبکہ وہ فرومایہ (اہل دنیا) کے حق میں موجب غیظ نہ بن جائے"

و ذقت حلاوۃ الاشیاء طرا
فاحلی حلوھا مر الفطام

"میں نے تمام اشیاء کی شیرینی کو چکھا، سو سب سے شیریں کو ایسا کڑوا پایا جیسے دودھ چھوڑا ہے جو کی تلخ چیز جو ماں پستان پر لگا دیتی ہے"

فما استحلیت من دنیای شیئا
صفی کترتیل آیات الامام

"سو میں نے اپنی دنیا سے کسی چیز کو شیریں نہیں پایا، بجز امام یعنی کتاب اللہ کی ترتیل آیات کے"

الذلک من یبغی فلاحا
ویرجو الخیر فی دار السلام

"ہر ایک طالب نجات، اور امیدوار جنت کے لئے سب سے زیادہ لائق"

ھدی للناس لیس بذی خفاء
ولود قد جلا سجف الظلام

toobaa-elibrary.blogspot.com

شرح اسماء اللہ الحسنیٰ

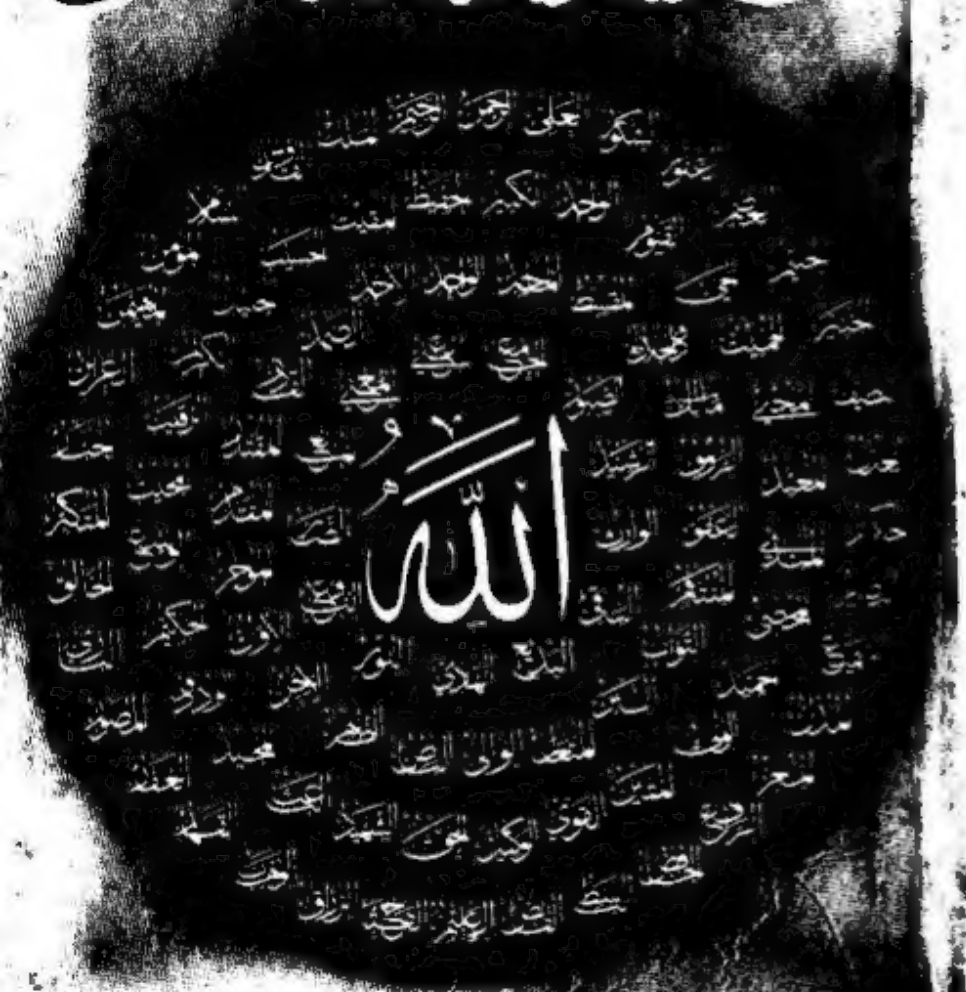

عارف کامل
حضرت مولانا
صفدر علی
رومی

ادارہ
تالیفات
اشرفیہ
ملتان

مواعظ و اسرار
مجدد الملت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی

صاحب کتاب کا مختصر تعارف

ولادت

۱۸۷۰ء میں گجرات کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔

تعلیم

اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء حضرت مولانا فیض الحسن لوہب سہارنپوری، مولانا عبداللہ ٹونکی اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔

تدریس

۱۸۹۱ء اسلامیہ کالج لاہور میں استاد مقرر ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں ریٹائر ہوئے۔

تصانیف

آپ کی تصانیف و تراجم میں الفناء والوفاء (حافظ ابن قیم) کا اردو ترجمہ کیا۔
امام غزالی کے رسائل حکمت بالله اور نعم الصحبۃ کے اردو تراجم بھی کیے۔
بو علی سینا کی کتاب اشارات کا تجلیات کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ قصیدہ سلسلۃ آشوب، حضرت علیؓ کے کلمات طیبات کا اردو ترجمہ کیا۔ مافی الاسلام، سیاحۃ الاسلام، علی الصارمی، دیوان رومی فارسی اور دیوان رومی عربی اور شرح اسماء اللہ الحسنیٰ خاص طور پر مشہور ہیں۔

اولاد

اولاد میں ایک دختر اور پانچ فرزند مولانا فضل حق، حافظ عبدالحق، ڈاکٹر محمد ضیاء الحق صوفی، ڈاکٹر رانا بہاؤ الحق اور رانا مظہر الحق آپ کی یادگار ہیں۔

وفات و تدفین

۱۹۵۴ء میں لاہور میں وصال ہوا اور حسب وصیت آپ کو اپنے گاؤں ضلع گجرات میں دفن کیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

toobaa-elibrary.blogspot.com